پاکستان

پاکستان وفاقی جمہوریہ ہے اور اس کی آبادی تقریباً 17 کروڑ 60 لاکھ ہے۔ 2008 میں انتخابات کے ذریعے ملک میں سویلین جمہوری حکومت بحال ہوئی۔ بین الاقوامی مبصرین کی نظر میں یہ انتخابات مقابلے کی بنیاد پر ہوئے اور ان سے لوگوں کی مرضی کی عکاسی ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کی مقتول لیڈر بے نظیر بھٹو کے شوہر، آصف علی زرداری، 6 ستمبر، 2008 کو صدر اور ملک کے سربراہ بن گئے۔ یوسف گیلانی وزیر اعظم اور حکومت کے سربراہ ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور وفاق میں اس کی مخلوط حکومت میں شامل شراکت دار، قومی حکومت میں انتظامیہ اور مقنّنہ کی شاخوں کو اور چار میں سے تین صوبائی اسمبلیوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

16 مارچ کو، "وکلا کی تحریک" کی طرف سے بڑے پیمانے پر مظاہروں، اور حزبِ اختلاف کی پاکستان مسلم لیگ-نواز (PML-N) پارٹی کے دباؤ کے بعد، وزیرِ اعظم گیلانی نے افتخار چودھری کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر، اور دس دوسرے ججوں کو ان کے عہدوں پر بحال کر دیا۔ ان سب کو اس وقت کے صدر پرویز مشرف نے نومبر 2007 میں ان کے عہدوں سے برطرف کیا تھا۔ 31 جولائی کو، سپریم کورٹ نے نومبر 2007 کے ہنگامی اور عبوری آئینی آرڈر کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ 16 دسمبر کو، سپریم کورٹ نے National Reconciliation Ordinance (NRO) کو منسوخ کر دیا۔ اس طرح اس آرڈیننس سے جن لوگوں کو فائدہ پہنچا تھا ان کے خلاف تمام کیس دوبارہ کُھل گئے۔ اس آرڈیننس کے تحت ان تمام سرکاری عہدے داروں کو جن کے خلاف کرپشن کے الزامات تھے، حکومت میں واپس آنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے یہ آرڈیننس غیر قانونی ہو گیا (اس طرح کرپشن کے کیسوں کو جاری رہنے کی اجازت دے دی گئی)۔ سال کے آخر میں، یہ بحث جاری رہی کہ آرڈیننس سے جن لوگوں کو فائدہ ہوا تھا ان کا کیا بنے گا۔ ان میں صدر، وزراء، اور پارلیمینٹ کے ارکان شامل ہیں۔ سیکورٹی فورسز اپنی کارروائیوں میں اکثر سویلین اختیار سے آزاد رہیں۔

اگرچہ سویلین حکومت نے کچھ مثبت اقدامات کیئے، لیکن انسانی حقوق کی مجموعی صورتِ حال خراب رہی۔ بڑے بڑے مسائل میں ماورائے عدالت قتل، اذیتیں دینا، اور لوگوں کا لاپتہ ہو جانا شامل ہیں۔ اجتماعی سزائیں، خاص طور سے وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقے (FATA) میں، جو فرنٹیر کرائمز ریگولیشن (FCR) کے قانونی ڈھانچے کے تحت آتے ہیں، مسئلہ بنی رہیں۔ مقدموں کی کارروائی مکمل ہونے میں بہت زیادہ تاخیر، اور خلاف ورزیوں کے مرتکب افراد کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں ناکامی کی وجہ سے بلا دھڑک من مانی کرنے کا ماحول پیدا ہو گیا۔ جیلوں کے خراب حالات، بلاجواز گرفتاریاں، اور مقدمہ چلانے سے پہلے طویل عرصے تک زیرِ حراست رکھے جانے کے ساتھ ساتھ، عدلیہ کی آزادی بھی مسئلہ بنی رہی۔ حکومت میں اور پولیس فورسز میں بڑے پیمانے پر کرپشن عام تھا اور حکومت نے اس مسئلے سے نمٹنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ عورتوں کی آبروریزی، گھریلو تشدد، جنسی طور پر ہراساں اور پریشان کرنا اور عورتوں کے خلاف بدسلوکی، جیسے سنگین مسائل باقی رہے۔ عزت کے نام پر کیئے جانے والے جرائم، اور امتیازی قوانین سے بالترتیب عورتیں اور مذہبی اقلیتیں متاثر ہوئیں۔ مذہبی آزادی کی خلاف ورزیاں اور مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان تصادم جاری رہا۔ وسیع پیمانے پر انسانوں کی تجارت، بچوں سے مشقت، اور قرض کے عوض بچوں کی غلامی اور جبری محنت کے مسائل چلتے رہے۔ بچوں کے ساتھ بدسلوکی، تجارتی پیمانے پر بچوں کا جنسی استحصال، معذوریوں والے افراد کے ساتھ امتیازی سلوک، اور کارکنوں کے حقوق کے احترام کا فقدان باعث تشویش رہا۔

پاکستان

عسکریت پسندوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے (NWFP) میں موسم بہار میں حملہ شروع کیا، اور مختصر مدت کے لیئے دارالحکومت کے 60 میل شمال میں کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس بحران کے انتہائی خراب زمانے میں، مالاکنڈ ڈویژن اور فاٹا کے کچھ حصوں سے عسکریت پسندوں کو نکالنے کے لیئے فوجی آپریشنز کے نتیجے میں، تقریباً تیس لاکھ افراد کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ جولائی کا مہینہ شروع ہوا تو مالاکنڈ ڈویژن کے خاندانوں نے اپنے گھروں کو واپس جانا شروع کر دیا۔ سال کے اختتام تک، تقریباً سولہ لاکھ ساٹھ ہزار افراد اپنے گھروں کی طرف لوٹ چکے تھے۔ 12 اگست کو پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن (HRCP) نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا ہے کہ مالاکنڈ کی شورش کے دوران، سرکاری سیکورٹی فورسز اور باغیوں، دونوں نے ماورائے عدالت قتل سمیت انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی تھیں۔

اس سال کے دوران، فاٹا اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں فوجی کارروائیوں میں تقریباً 1,150 سویلین باشندے ہلاک ہوئے، اور فاٹا اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں عسکریت پسندوں کے حملوں میں مزید 825 سویلین ہلاک ہوئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد میں تقریباً 1,125 افراد ہلاک ہوئے۔ پورے ملک میں 65 سے زیادہ خودکش بمباری کے حملوں میں، اندازاً 970 افراد ہلاک ہوئے۔ بلوچستان میں، نچلی سطح کی جو بغاوت جاری ہے، اس میں میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق، تقریباً 125 سویلین ہلاک ہوئے ہیں۔ عسکریت پسندوں کے ساتھ جاری جھڑپوں میں داخلی طور پر بے گھر ہونے والوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ سال کے آخر میں، شمال مغربی سرحدی صوبے اور فاٹا میں بے گھر ہونے والوں کی تعداد اندازاً بارہ لاکھ تھی۔

انسانی حقوق کا احترام

سیکشن 1 فرد کی شخصیت کا احترام، بشمول ان چیزوں سے آزادی:

a۔ بلاجواز یا غیر قانونی طریقے سے زندگی سے محرومی

سرکاری ایجنٹوں اور سیاسی وجوہ کی بنا پر ناوابستہ افراد کے ہاتھوں اندھا دھند قتل کی وارداتیں سال کے دوران جاری رہیں۔ اسی طرح لڑائی میں سویلین باشندوں کا بلاجواز یا غیر قانونی قتل بھی جاری رہا (دیکھیئے سیکشن 1.g.)۔

بعض مخصوص افراد کو نشانہ بنا کر قتل کیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر جرائم کے ارتکاب کا الزام تھا۔ یہ لوگ سرکاری تحویل کے دوران جعلی پولیس مقابلوں میں اور جسمانی اذیتیں دیے جانے کے دوران ہلاک ہوئے۔ اس سال کے دوران، Society for Human Rights and Prisoner's Aid (SHARP) نے جو ایک غیر سرکاری تنظیم (NGO) ہے، اطلاع دی کہ پولیس کے ساتھ مقابلوں میں 72 سویلین ہلاک ہوئے اور جیلوں میں 168 اموات ہوئیں۔ یہ تعداد پچھلے سال کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ یہ اموات اس وقت ہوئیں جب مشتبہ افراد نے فرار ہونے کی کوشش کی، گرفتاری میں مزاحمت کی، یا خودکشی کر لی۔ انسانی حقوق کے مبصرین، گھرانے کے افراد، اور میڈیا کی اطلاع کے مطابق، سیکیورٹی فورسز نے ان میں سے بہت سے واقعات کا ڈرامہ رچایا تھا۔ اگرچہ حکومت نے ان واقعات کی تفتیش کی اور بعض اوقات مقدمہ چلا کر ماورائے عدالت قتل کی وارداتوں کے الزام میں پولیس کے عہدے داروں کو سزا بھی ہوئی، لیکن مقدموں میں طویل تاخیر، اور خلاف ورزیوں کا

پاکستان

ارتکاب کرنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی اور ان پر باقاعدگی سے مقدمہ چلانے میں ناکامی کی وجہ سے، دیدہ دلیری کے ساتھ قانون کی خلاف ورزی کے کلچر کو فروغ ملا ہے۔

15 ستمبر کو، نیو یارک ٹائمز کی اطلاع کے مطابق، پولیس کی دو دن کی پوچھ گچھ کے بعد، ایک عیسائی رابرٹ فانش (Robert Fanish) جسے توہینِ مذہب کے الزامات میں گرفتار کیا گیا تھا، سیالکوٹ کی جیل میں اپنے کوٹھری میں مردہ پایا گیا۔ پولیس کا بیان ہے کہ فانش نے اپنے کپڑوں سے ایک پٹی پھاڑ کر، اس سے اپنے آپ کو لٹکا لیا۔ انسانی حقوق کے 30 سے زیادہ گروپوں کے ایک اتحاد، the Joint Action Committee for People's Rights کا بیان ہے کہ اس نے گواہوں سے بات کی جنھوں نے اس کے جسم پر اذیتیں دیے جانے کے نشانات دیکھے۔ سرگرم کارکنوں نے ملک بھر میں بہت سے مظاہرے کیئے، اور 17 ستمبر کو، صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے اس موت کی انکوائری کا حکم دیا۔ سال کے آخر تک یہ انکوائری مکمل نہیں ہوئی تھی۔

پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن (HRCP)، نیو یارک ٹائمز، اور کئی مقامی مطبوعات نے اطلاع دی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور سوات میں بغاوت کو کچلنے کی کارروائیوں کے دوران، مبینہ طور پر 300 سے 400 افراد سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ماورائے عدالت ہلاک ہوئے۔ 12 اگست کو مالاکنڈ ڈویژن میں حقائق معلوم کرنے کے اپنے تین روزہ مشن کی تکمیل کے بعد، HRCP نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں ماورائے عدالت قتل اور شورش زدہ علاقے میں اجتماعی قبروں کے بارے میں دستاویزی بیانات شامل تھے۔

اخبار ڈان اور دی نیوز کے مطابق، سوات میں یکم ستمبر تک 251 لاشیں برآمد کی جا چکی تھیں۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میڈیا کی ان تنظیموں نے اپنے اعداد و شمار کہاں سے حاصل کیئے۔ HRCP کی رپورٹ کے مطابق، سوات میں رہنے والوں نے بتایا کہ انھوں نے اس علاقے میں اجتماعی قبریں دیکھی ہیں۔ ان میں کم از کم ایک قبر ضلع سوات کی بابوزئی تحصیل کے کوکارے گاؤں میں دیکھی گئی اور ایک اور قبر تحصیل کبال میں دیولائی اور شاہ ڈھیری کے درمیانی علاقے میں تھی۔ رپورٹ کے مطابق، جن گواہوں نے اجتماعی تدفین کا مشاہدہ کیا تھا، انھوں نے کہا کہ کم از کم کچھ لاشیں طالبان عسکریت پسندوں کی معلوم ہوتی تھیں۔ HRCP نے تسلیم کیا کہ ان غیر مصدقہ قبروں میں سے کچھ میں طالبان عسکریت پسند مدفون ہو سکتے تھے یا یہ ان سویلین باشندوں کی قبریں ہو سکتی ہیں جو جنگی کارروائیوں کے دوران ہلاک ہوئے۔

ڈان میڈیا اور مقامی ٹیلیویژن اسٹیشنوں کے مطابق، اگست کے شروع میں ایسے افراد کی لاشیں جنہیں ماورائے عدالت قتل کیا گیا تھا، صوبہ سرحد، سوات میں نظر آنا شروع ہوئیں۔ ہلاکتوں کی ذمہ دار پارٹیوں کی نشاندہی نہیں ہوئی ہے۔ ڈان کے مطابق، 24 اگست کو، مکینوں نے منگورہ کے مشرق میں ایک قصبے میں 15 لاشیں دیکھیں، اور 15 اگست کو شہریوں نے سوات کے مختلف حصوں میں مزید 18 لاشیں دریافت کیں۔ نیو یارک ٹائمز نے اطلاع دی کہ یکم ستمبر کو سپاہیوں کے ایک گروپ نے منگورہ میں اختر علی کو اس کی بجلی کے کام کی دوکان سے گرفتار کیا۔ خاندان کے افراد اس کی گرفتاری کے اگلے روز فوج کے ہیڈ کوارٹرز گئے، اور حکام نے انہیں یقین دلایا کہ علی کو رہا کر دیا جائے گا۔ اہل خانہ نے 5 ستمبر کو ایک درخواست درج کرائی جس میں کہا گیا تھا کہ سیکورٹی فورسز علی کی لاش کو ان کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ اہل خانہ کے مطابق، " اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جسے اذیتیں نہ دی گئی ہوں۔"

12 اگست کو، HRCP نے ایک رپورٹ اور ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ " سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی حوصلہ شکنی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے اگر مملکت کوئی ایسا شفاف نظام قائم کرے جس کے ذریعے لڑائی کے دوران اور لڑائی ختم ہونے کے

پاکستان

بعد کے دور میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی نگرانی کی جاسکے، اور مملکت قانونی ضابطوں کے مطابق انصاف فراہم کرنے کی اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔ سال کے آخر تک، حکومت نے اس معاملے کی تفتیش کے لیئے یا ہلاکتوں کے ذمہ دار افراد کی جوابدہی کے لیئے کوئی اقدامات نہیں کیئے تھے۔

2008ء میں ہونے والی مندرجہ ذیل اموات کے بارے میں کوئی تازہ معلومات دستیاب نہیں کی گئی تھیں: جنوری میں خانیوال، پنجاب میں، پولیس کی حراست میں اللہ بخش کی ہلاکت؛ فروری میں زیر حراست عرفان خان اور جان مسیح کی ہلاکت؛ مئی میں لاہور کے ایک پولیس اسٹیشن میں جعفر حسین کے ہاتھوں رفیق مسیح کی اذیت رسانی؛ اگست میں شیخوپورہ، پنجاب میں پولیس کے ہاتھوں فلک شیر کی اذیت رسانی؛ یا جون میں پولیس کی تحویل میں ادریس احمد کی ہلاکت۔

2008ء کے اس کیس میں کوئی نئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں جیل کے محافظوں نے مبینہ طور پر کراچی کی ملیر ڈسٹرکٹ جیل میں فساد کے دوران تین قیدیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، اور چوتھے قیدی کو، مبینہ طور پر کسی کند آلے سے ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا۔ سال کے آخر میں، 2007ء میں کراچی میں پولیس کی تحویل میں علی نواز کی موت کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

سال کے آخر میں، 2007ء میں سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کی موت کا کیس بھی حل نہیں ہوا تھا۔

سال کے آخر میں، ملک ظہیر کو مبینہ طور پر اذیتیں دیے جانے کا معاملہ لاہور ہائی کورٹ کے زیر غور تھا۔ جب اس پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا اس زمانے میں ابتدائی تفتیش میں کہا گیا تھا کہ اس کی موت قدرتی اسباب کی بنا پر ہوئی۔ بعد کی تفتیش سے اس کے جسم پر اذیتیں دیے جانے کے شواہد ظاہر ہوئے، اور ظہیر کے رشتے داروں نے لاہور ہائی کورٹ میں سرکاری تفتیش کے نتائج کے خلاف اپیل دائر کی۔ سال کے آخر تک، حکومت نے اس کیس میں نہ کسی کو گرفتار کیا تھا اور نہ کوئی فرد جرم عائد کی تھی۔

پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل، عارف بھنڈر کی موت کی انکوائری، جنہیں 2007ء میں لاہور میں ہلاک کیا گیا تھا، سال کے آخر میں لاہور کی انسدادِ دہشت گردی کی عدالت میں، آخری مرحلوں میں تھی۔ حکام نے اس کیس کے سلسلے میں چھ افراد کو گرفتار کیا۔ ان میں دو افراد جرم میں معاونت کے الزام میں گرفتار کیئے گئے۔

سیاسی دھڑوں یا نامعلوم قاتلوں کے ہاتھوں سیاسی عوامل کی بنا پر قتل کی رپورٹیں بھی ملیں۔ اس قسم کے کیسوں کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

3 اپریل کو، نامعلوم قاتلوں نے تربت میں بلوچستان نیشنل موومنٹ (BNM) کے صدر غلام محمد بلوچ، شیر محمد بلوچ، اور بلوچستان ریپبلیکن پارٹی (BRP) کے لالہ منیر بلوچ کو ہلاک کر دیا۔ ایشیا ہیومن رائٹس کمیشن (AHRC) کے مطابق، سویلین کپڑوں میں ملبوس 12 افراد نے BNM کے تین لیڈروں پر اس وقت حملہ کیا جب وہ ضلع تربت میں عدالت کے اجلاس کے بعد باہر آئے۔ ان کے وکیل، کشکول علی نے مقامی پولیس کو بتایا کہ ملٹری انٹیلی جنس (اور انٹر سروس انٹیلی جنس (ISI) کا عملہ اس حملے کا ذمے دار تھا۔ پولیس نے فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (FIR) درج کرنے سے انکار کر دیا۔ AHRC کی رپورٹ کے مطابق، ان تین افراد کی لاشیں 8 اپریل کو پکرک میں ملیں۔

HRCP کی 8 جولائی کی رپورٹ کے مطابق، کراچی میں سال کے پہلے نصف حصے کے دوران، سیاسی پارٹیوں کے درمیان جھڑپوں میں تقریباً 100 سیاسی کارکن ہلاک ہوئے۔ بہت سے کارکنوں کا تعلق مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم حقیقی)، متحدہ قومی موومنٹ ((ایم کیو ایم)، پی پی پی، اور

پاکستان

عوامی نیشنل پارٹی (ANP) سے تھا۔HRCP کے مطابق، کراچی میں جنوری سے جون تک کے عرصے میں سیاسی اور نسلی تشدد، مختلف گینگوں کے درمیان جنگوں، مخصوص لوگوں کو نشانہ بنا کر قتل کرنے کی وارداتوں، پولیس کے ساتھ مقابلوں، ذاتی دشمنیوں، عزت کے نام پر قتل، اور دوسرے کیسوں میں 938 افراد ہلاک ہوئے۔ وزیر داخلہ نے اطلاع دی کہ جولائی سے اب تک، کراچی میں 256 افراد کو نشانہ بنا کر قتل کیا گیا۔

23 اگست کو، اوتھل، بلوچستان میں، نامعلوم قاتلوں نے BNM کے مرکزی جوائنٹ سکریٹری، رسول بخش مینگل کو اغوا کر لیا۔ AHRC کے مطابق، BNM اور دوسرے قوم پرست گروپوں کو شبہ ہے کہ مسلح فرنٹیئر کنسٹبلری یا انٹیلی جینس کے عہدے داروں نے مینگل کو اغوا کیا اور فوج کی کوٹھریوں میں ان پر تشدد کیا۔ ان کی لاش 31 اگست کو بیلا میں ایک درخت سے لٹکی پائی گئی۔ ان کے جسم پر اذیتیں دیے جانے کے نشانات تھے، جن میں سگریٹ سے جلائے جانے کے نشان اور جلد پر کندہ کیئے ہوئے الفاظ شامل ہیں۔ ان کی موت پر خضدار اور مکشے میں تشدد پھوٹ پڑا۔

منتخب سویلین حکومت حملوں کی زد میں رہی، خاص طور سے شمال مغربی صوبے میں مخلوط حکومت کی شراکت دار عوامی نیشنل پارٹی (ANP)۔ 11 فروری کو، پشاور میں ریموٹ کنٹرول بم کے حملے میں صوبائی اسمبلی میں ANP کے رکن، عالم زیب خان ہلاک ہوگئے اور سات دوسرے افراد زخمی ہوئے۔ 11 مارچ کو، دو خودکش بمباروں نے، ANP کے سینیئر لیڈر، بشیر بلور کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ وہ بچ گئے لیکن اس حملے میں چار افراد ہلاک ہوئے۔ یکم دسمبر کو، سوات میں بم کے خودکش حملے میں ANP کے صوبائی اسمبلی کے رکن، شمشیر علی خان ہلاک ہوگئے اور 11 دوسرے افراد ہلاک ہوئے۔ دہشت گردوں نے پورے شمال مغربی سرحدی صوبے میں، ANP کے درجنوں سرگرم کارکنوں کو قتل کرنے کے لیئے نشانہ بنایا۔

سال کے اختتام تک، سندھ ہائی کورٹ میں ان لوگوں پر مقدمہ چل رہا تھا جنہیں 40 سے زیادہ سیاسی کارکنوں کی ہلاکت کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ لوگ 2007ء میں اس وقت کے معطل کیئے ہوئے چیف جسٹس افتخار چودھری کی آمد کے موقعے پر کیئے جانے والے مظاہروں کے دوران ہلاک ہوئے تھے۔

2007ء کی خودکش بمباری کے سلسلے میں جن تین افراد کو گرفتار کیا گیا تھا، اس کے بارے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس واردات میں اسلام آباد میں 11 پولیس افسر اور آٹھ سویلین ہلاک ہوئے تھے۔

پولیس نے ان دو خودکش بمباروں کے کیس میں کوئی گرفتاری نہیں کی جنھوں نے کراچی میں، 2007ء میں سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی واپسی پر ان کا خیر مقدم کرنے والے جلوس کے دوران 130 سویلین افراد اور 11 پولیس افسروں کو ہلاک کیا تھا۔

سال کے اختتام تک، بے نظیر بھٹو کے 2007 کے قتل کے سلسلے میں کوئی مشتبہ ملزم زیر حراست نہیں تھا۔ جولائی 2008 میں اقوام متحدہ نے اصولی طور پر حکومت پاکستان کی اس درخواست پر رضامندی ظاہر کی کہ اس حملے کی تفتیش شروع کی جائے۔ اس حملے میں بے نظیر بھٹو کے کم از کم 30 حامی اور پولیس والے بھی ہلاک ہوئے تھے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ نے جنوری 2008ء میں تفتیش کے کام میں مقامی پولیس کی مدد کی، لیکن اس نے اس پہلو پر چھان بین نہیں کی کہ اس حملے کا ارتکاب کس نے کیا تھا۔ جولائی میں اقوام متحدہ کی تین رکنی انکوائری ٹیم نے اقوامِ متحدہ میں چلی کے سفیر، Heraldo Munoz کی سربراہی میں اس کیس کی انکوائری شروع کی اور پاکستان کا دورہ کیا۔ اس ٹیم کو جس کا دائرہ کار یہ تھا کہ وہ اس واقعے کے "حقائق اور حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی رپورٹ پیش کرے" 31 دسمبر کو اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ نومبر میں ٹیم نے انکوائری مکمل کرنے کے لیئے تین مہینے کی توسیع کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

پاکستان

حکومت نے 2007ء میں کرال چوک میں پاکستان مسلم لیگ (N) کے لیڈر نواز شریف کی طرف سے منعقد کیئے ہوئے سیاسی جلسے میں سات افراد کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں مزید کوئی اقدامات نہیں کیئے۔

سال کے آخر تک، سپریم کورٹ نے اسلام آباد کی لال مسجد کے اندر موجود مسلح عسکریت پسندوں کے خلاف 2007ء کی فوجی کارروائی کی قانونی حیثیت کے بارے میں اپنا فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ اس حملے میں 106 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ حکومت نے مسجد سے وابستہ مدرسے کو دوبارہ کھولنے کی اجازت نہیں دی، لیکن ایک اور مدرسے، جامعہ فریدیہ کو، حکومت کی نگرانی میں کام دوبارہ شروع کرنے کی اجازت دے دی۔

سال کے دوران، فاٹا کے باہر، فرقہ پرست، مذہبی انتہاپسند، اور دہشت گرد گروپوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی طرف سے عبادت گاہوں، مذہبی اجتماعات، اور مذہبی لیڈروں پر حملوں کے نتیجے میں سینکڑوں اموات کی اطلاعات ملیں۔ HRCP نے اطلاع دی کہ اگست کے خاتمے تک، فرقہ وارانہ تشدد میں 215 افراد ہلاک اور 573 زخمی ہو چکے تھے۔ ان کیسوں کی چند مثالیں یہ ہیں:

31 جولائی اور یکم اگست کو، مسلمانوں کے ہجوموں نے، جنہیں اطلاعات کے مطابق کالعدم فرقہ پرست انتہاپسند تنظیم سپاہِ صحابہ کے حامیوں نے اکسایا تھا، پنجاب میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نزدیک گوجرہ اور کوریاں کی بستیوں میں رہنے والی عیسائی کمیونٹی پر حملہ کر دیا۔ الزامات یہ لگائے گئے کہ مقامی عیسائیوں نے قرآن شریف کی بے حرمتی کی ہے۔ اس ہجوم نے آٹھ عیسائیوں کو ہلاک کر دیا اور تقریباً 100 گھر جلا دیے۔ پولیس اس تشدد کو روکنے میں ناکام رہی۔ قومی اسمبلی نے ایک متفقہ قرار داد منظور کی جس میں گوجرہ میں ہلاکتوں کی مذمت کی گئی، اور پنجاب کے اقلیتوں کے امور کے وزیر نے، اس کارروائی میں شرکت کرنے والوں کے خلاف قانونی شکایت درج کرائی۔ سال کے اختتام تک پولیس نے گوجرہ کے واقعے کے سلسلے میں 42 افراد کو گرفتار کیا تھا۔ ان میں سے 34 ضمانت پر رہا کر دیے گئے جب کہ آٹھ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پولیس کی حراست میں رہے۔ صوبائی حکومت نے عیسائی کمیونٹی کے لوگوں کے لیئے جن کے گھر تشدد میں ضائع ہو گئے تھے، نئے مکان بنانے کا پروگرام شروع کیا۔ تعمیر نو کا یہ کام سال کے اختتام تک جاری تھا۔

سال کے اختتام تک، حکام نے 2008ء کے مندرجہ ذیل کیسوں کی تفتیش کے لیئے مزید کوئی اقدام نہیں کیا تھا: اپریل میں مارپیٹ سے جگدیش کمار کی ہلاکت، مئی میں عدیل مسیح کا قتل، یا جون میں صوبہ سرحد میں ڈیرہ اسماعیل خان کی ایک شیعہ مسجد پر بموں سے حملہ۔

سال کے آخر تک، حکومت نے ستمبر 2008ء میں صوبہ سندھ کے دو احمدی لیڈروں، ڈاکٹر عبدالمنان صدیقی اور سیٹھ محمد یوسف کے قتل کے سلسلے میں کوئی اقدامات نہیں کیئے تھے۔ ستمبر 2008ء میں جیو ٹیلیویژن کے مذہبی امور کے پروگرام کے مقامی میزبان، عامر لیاقت حسین نے اعلان کیا کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق احمدی فرقے کے ارکان کا قتل ضروری ہے۔ انھوں نے دو مذہبی عالموں کو جو اس پروگرام میں مہمان تھے، اپنے موقف کی تائید پر اکسایا۔

b۔ لاپتہ ہو جانا

سال کے دوران سیاسی محرکات کی بنا پر گمشدگیوں کا سلسلہ جاری رہا، اور پولیس اور سیکورٹی فورس نے قیدیوں کو نامعلوم مقامات پر رکھا اور ان کا اتا پتا بتانے سے انکار کر دیا۔ SHARP نے اطلاع دی کہ سیکورٹی فورسز نے سینکڑوں افراد کو اتا پتا بتائے قید کر رکھا ہے۔ 21 اگست کو، وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے میڈیا کو بتایا کہ ملک میں تقریباً 1,291 افراد لاپتہ ہیں۔ وزیرِ داخلہ کے مطابق، اس مسئلے کی چھان بین کے لیئے ایک مشترکہ

پاکستان

تفتیشی ٹیم قائم کی گئی ہے۔ بعض گمشدگیوں کا تعلق دہشت گردی اور قومی سلامتی سے ہے اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے اطلاع دی ہے کہ لاپتہ افراد میں بہت سے سندھی اور بلوچ قومت پرست شامل ہیں۔ ایمنیسٹی انٹر نیشنل کے مطابق، بچے بھی اپنے رشتے داروں کے ساتھ لاپتہ ہوگئے ہیں۔

بلوچ لوگوں کی گمشدگی اس سال کے دوران مسئلہ بنی رہی اور بلوچ سیاسی گروپوں نے زیادہ سیاسی اور انسانی حقوق کا مطالبہ کیا۔ دسمبر میں بلوچستان کے محکمہء داخلہ نے صوبے کے 992 افراد کی فہرست جاری کی جو کئی برسوں سے لاپتہ ہیں۔ HRCP نے اس سال کے دوران بلوچستان سے "جبری گمشدگی" کے 30 نئے کیسوں کی اطلاع دی، جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے:

HRCP کے مطابق، 6 فروری کو سیکورٹی فورسز نے BRP کے ایک رکن جلیل رکئی کو سریاب کچی بیگ میں ان کے گھر پر چھاپے کے دورن گرفتار کیا۔ سال کے آخر تک وہ لاپتہ تھے۔

AHRC کے مطابق، یکم اگست کو، فرنٹیئر کور نے بلوچستان نیشنل پارٹی کے ارکان، لطیف بلوچ اور جاوید بلوچ کو خضدار میں گرفتار کیا۔ 3 اگست کو، فرنٹیئر کور کے افسروں نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ دونوں افراد کے جسم پر اذیتیں دیے جانے کے نشانات موجود تھے۔ اطلاع کے مطابق، حکام نے انہیں رہا کرنے سے پہلے، جرم کا جھوٹا اعتراف کرنے پر مجبور کیا۔

HRCP کے مطابق، 21 اگست کو نفاذِ قانون کی ایک ایجنسی کے مسلح عملے نے مبینہ طور پر سعد اللہ بلوچ (عرف ایم صادق) خضدار میں اغوا کیا۔ فوج کے ایک نزدیکی چیک پوائنٹ کے عملے کو جب اس اغوا کی اطلاع دی گئی، تو انھوں نے بتایا کہ سعد کو پوچھ گچھ کے لیئے گرفتار کیا گیا ہے لیکن اسے جلد ہی رہا کر دیا جائے گا۔ اس سال کے اختتام تک، وہ لاپتہ تھا۔

2007 میں اس وقت کے صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف مشرف کے اس فیصلے سے کہ آئین کو منسوخ کر دیا جائے اور سپریم کورٹ کو برطرف کر دیا جائے، عملی طور پر گمشدگی کے ان 600 کیسوں پر کارروائی رُک گئی جو عدالت کے زیر غور تھے اور چیف جسٹس چودھری کی ان کوششوں کا حصہ تھے کہ حکومت یا تو ان قیدیوں کو رہا کرے یا ان کی حراست کو قانونی شکل دے جنہیں مختلف سیکورٹی ایجنسیوں نے نامعلوم مقامات پر قید کیا ہوا ہے۔ نومبر میں سپریم کورٹ نے گمشدہ افراد کے کیسوں کی سماعت پھر شروع کی، جب 38 افراد پر مشتمل 15 خاندانوں نے اسلام آباد میں عدالت کی عمارت کے باہر کیمپ لگا دیا۔ سپریم کورٹ نے وزارتِ داخلہ کو ہدایت کی کہ وہ گمشدہ شہریوں کے بارے میں مکمل تفصیلات فراہم کرے۔ عدالت نے کہا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے گمشدہ افراد کا اتا پتا معلوم کرنے کی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ Defense for Human Right Pakistan (DHRPK) نے اطلاع دی ہے کہ سویلین قیادت کے تحت حکومت قائم ہونے کے بعد، کچھ لوگ جن کے بارے میں نئی گمشدگی کی اطلاعات ملی تھیں، تین مہینے کی اوسط مدت کے دوران ایک جیل میں تلاش کر لیئے گئے اور ان پر باقاعدہ کسی جرم کا الزام عائد کر دیا گیا۔ ان کیسوں میں خاندان کے لوگوں اور وکیلوں کو قیدیوں تک رسائی مل گئی ہے۔ DHRPK نے جنوری سے جولائی کی مدت کے دوران، لاپتہ ہونے کے 104 نئے کیسوں کی اطلاع بھی دی۔

پاکستان

26 نومبر کو، راولپنڈی کی انسدادِ دہشت گردی کی عدالت نمبر 2 نے بھکّر کے رہنے والے شخص اسامہ بن وحید عرف ہدایت اللہ اور کراچی کے ذیشان جلیل عرف خضر کے کیسوں کو عام عدالت میں سماعت کے لیئے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے حوالے کر دیا۔ وحید اور جلیل مبینہ طور پر کراچی سے 2008 میں لاپتہ کیئے گئے تھے۔

وحید کمبرانی اور شیر دل خان جنہیں خضدار، بلوچستان کے ایک ریستوراں سے 2007 میں پکڑا گیا تھا، اور ایک مہینے تک ایک نامعلوم مقام پر رکھا گیا تھا، سال کے آخر تک قید میں تھے۔ ان کے خلاف الزامات کی تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

c۔ اذیت رسانی اور دوسرے اقسام کے ظالمانہ، غیر انسانی، یا ذلت آمیز سلوک یا سزائیں

قانون کے تحت اذیت رسانی اور دوسرا ظالمانہ، غیر انسانی، یا ذلت آمیز سلوک یا سزا ممنوع ہے، لیکن ایسی اطلاعات ملیں کہ انٹیلی جنس سروسز سمیت سیکورٹی فورسز نے، زیر حراست افراد کو اذیتیں دیں اور ان کے ساتھ بد سلوکی کی۔ انسدادِ دہشت گردی کے قانون کی شقوں کے تحت، انسداد دہشت گردی کی عدالتوں میں دباؤ کے تحت حاصل کیئے ہوئے اقرار جرم قابلِ قبول ہیں۔ سال کے دوران، غیر سرکاری تنظیم SHARP نے پولیس کے ہاتھوں اذیت رسانی کے 2,300 کیسوں کی اطلاعات دیں۔ ان میں سے بیشتر واقعات پنجاب میں ہوئے۔ مبصرین نے یہ بات نوٹ کی کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اذیت رسانی کے واقعات کی بہت کم اطلاع دینا عام ہے۔ اذیتیں دینے کے نتیجے میں بعض اوقات موت واقع ہوئی یا شدید نوعیت کے زخم آئے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے اذیتیں دینے کے طریقوں کے بارے میں اطلاع دی۔ ان میں ڈنڈوں اور کوڑوں سے مارنا، سگریٹ سے جلانا، پیر کے تلووں میں کوڑے مارنا، طویل عرصے تک قید تنہائی میں رکھنا، بجلی کے جھٹکے دینا، غذا یا نیند سے محرومی، الٹا لٹکانا، اور ٹانگوں کو زنجیروں سے زبردستی چیرنا شامل ہیں۔

اطلاعات کے مطابق سیکورٹی فورسز کے عملے نے پوچھ گچھ کے دوران عورتوں کی آبروریزی کی۔ حکومت نے شاذ و نادر ہی ان حرکتوں کے ذمہ دار لوگوں کے خلاف کارروائی کی۔ 2006 کے Women's Protection Act سے قبل، حدود آرڈیننس کے تحت شرعی قانون کی خلاف ورزی پر، عضو کاٹنے اور سنگساری کے ذریعے موت سمیت سزائیں دی جا سکتی تھیں۔ اس قسم کی کوئی اطلاعات نہیں ملیں کہ حکام نے سال کے دوران اس قسم کی سزائیں عائد کی ہوں۔

6 اکتوبر کو ایک 10 منٹ کا وڈیو سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ Facebook پر لگا دیا گیا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ فوج کے ارکان گرفتار کیئے ہوئے کئی سویلین باشندوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اور انہیں مار پیٹ رہے ہیں۔ گرفتار شدہ کچھ لوگ بوڑھے تھے۔ BBC کے مطابق اگرچہ وڈیو کی تاریخ اور مقام کا تعین نہیں ہو سکا، وڈیو میں جو بات چیت دکھائی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوات میں جون اور اکتوبر کے درمیانی عرصے میں بنائی گئی ہے۔ فوجی افسروں نے مشتبہ افراد کو ٹھوکریں ماریں، اور بیلٹس سے، مکوں سے اور چھوٹے کوڑوں سے مارا۔ اس کے بعد وڈیو میں موجود افسر نے ایک مشتبہ شخص کو ہاتھ پاؤں توڑنے کی دھمکی دی۔ فوج کے ایک ترجمان نے وڈیو پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا، اور ایسے کوئی قرائن نہیں ملے کہ حکومت نے اس مبینہ واقعے کی تفتیش کی ہو۔

پاکستان

9 جولائی کو Human Rights Watch (HRW) نے برطانوی حکومت سے کہا کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کے مشتبہ افراد کے خلاف تشدد کے استعمال میں برطانوی ایجنسیوں اور پاکستانی ایجنسیوں کے درمیان ملی بھگت کی رپورٹوں کی تحقیقات کرے۔

سال کے آخر تک حکومت نے سب انسپکٹر شجاعت علی ملی اور دوسرے پولیس افسروں پر مقدمہ چلانے کے لیئے اقدامات نہیں کیے تھے۔ ان لوگوں پر مبینہ طور پر مارچ 2006 میں فیصل آباد میں ایک 17 سالہ گمنام لڑکی کو اذیتیں دینے اور اس کی آبروریزی کرنے کے الزامات تھے۔

اگست 2008 کے آغا محبوب احمد کیس میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں بنک کے ڈاکے میں ملوث ہونے کے شبہے میں گرفتار کیا گیا تھا، اور مبینہ طور پر حیدرآباد کرمنل انویسٹی گیشن ایجنسی سینٹر میں اذیتیں دی گئی تھیں۔

2007 ء میں حضور بخش ملک کی گرفتاری کے کیس میں، یا لاہور پولیس افسروں کے ہاتھوں گاڑیوں کے ایک چیک پوائنٹ پر ایک عورت کی اجتماعی آبروریزی کے واقعے میں کوئی نئی خبر نہیں ملی۔

مبارک علی کے کیس میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جنہیں 2007 ء میں اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب انھوں نے ایک مقامی پولیس عہدے دار کے بارے میں ایک شکایت پیش کی تھی۔ حراست کے دوران، اطلاعات کے مطابق، پولیس نے اسے مارا پیٹا جس کے نتیجے میں انہیں شدید زخم آئے۔ جب یہ واقعہ میڈیا کے علم میں آیا، تو پولیس نے تفتیش کی اور پولیس کے عملے کے تین افراد کو معطل کر دیا۔ عملے کے یہ افراد جن پر جرم کا الزام تھا، اگست میں لاپتہ ہو گئے، اور علی کے گھرانے کے لوگوں نے الزام لگایا کہ پولیس نے ان لوگوں کو فرار ہونے کی اجازت دی۔

جیلوں اور حراستی مراکز کے حالات

جیلوں کے حالات انتہائی خراب تھے اور بین الاقوامی معیاروں کے مطابق نہیں تھے۔ مالدار یا بااثر قیدیوں کے سوا، جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کا ہجوم تھا۔ SHARP کے مطابق 95,000 سے زیادہ قیدیوں کو 72 جیلوں میں رکھا گیا ہے۔ یہ جیلیں ابتدا میں 36,000 قیدیوں کے رکھنے کے لیئے بنائی گئی تھیں۔

جیلوں میں ناکافی غذا اور طبّی سہولتوں کے فقدان سے ان قیدیوں کے لیئے جو اپنی غذا کے لیئے خاندان کے لوگوں یا دوستوں سے مدد نہیں لے سکتے تھے، صحت اور غذائیت کے سنگین مسائل پیدا ہو گئے۔ قیدیوں کے بارے میں گلوبل فاونڈیشن کی نومبر کی رپورٹ کے مطابق، پنجاب بھر کی جیلوں میں 197 قیدی ایچ آئی وی/ایڈز کے مریض تھے۔ ان میں سے 30 مریض اڈیالہ سینٹرل جیل میں تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سندھ کی جیلوں میں ایچ آئی وی/ایڈز کے مریضوں کی تعداد 55 تھی۔ ان میں لاڑکانہ جیل میں 21 مریض اور 34 مریض کراچی سینٹرل جیل میں تھے۔

غیر ملکی قیدی اکثر اپنی سزا کاٹنے کے بعد بھی طویل عرصے تک جیل میں رہے کیوں کہ وہ اپنے ملکوں کی واپسی کے اخراجات ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔

اطلاعات کے مطابق، پولیس نے قیدیوں کو اذیتیں دیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کیا، اور بعض اوقات ماورائے عدالت قتل کیئے۔ مسیحی اور احمدی کمیونٹیوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے ارکان کے ساتھ بدسلوکی کا خطرہ زیادہ تھا۔ غیر مسلم قیدیوں کو عموماً مسلمان قیدیوں کے مقابلے میں زیادہ خراب سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں، اور اکثر دوسرے قیدی ان پر تشدد کرتے تھے۔

پاکستان

اڈیالہ جیل میں سزائے موت کے ایک قیدی مرزا سرفراز کی جانب سے اذیت رسانی کی شکایت کے بعد، جون 2008 ء میں، عدلیہ نے جیلوں کی حالت اور جیلوں کے محکمے کے بارے میں انکوائری شروع کی۔ انکوائری سے پتہ چلا کہ جو قیدی رشوت نہیں دیتے تھے ان پر ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ جیو ٹی وی کی ویب سائٹ کے مطابق، اڈیالہ جیل میں قیدیوں کی تعداد 5000 تھی جب کہ ان میں 1994 قیدیوں کی گنجائش تھی۔ اڈیالہ جیل میں کچھ عورتیں بھی قید تھیں جن کے بچے ان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ بچوں کے لیئے کوئی الگ انتظام نہیں تھا۔ سال کے دوران سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور وزیرِ داخلہ نے پہلے سے اعلان کیے بغیر اڈیالہ جیل کا دورہ کیا اور جیل میں رہنے کے حالات بہتر بنانے کا حکم دیا۔ اکتوبر میں چیف جسٹس کی ہدایات پر، ضلعی عدالتوں کے تمام ججوں نے اڈیالہ جیل کا دورہ کیا۔ انھوں نے 42 افراد کو رہا کر دیا جن پر معمولی نوعیت کے الزامات تھے۔

اکتوبر میں ڈیلی ٹائمز نے اطلاع دی کہ کہ قومی عدالتی پالیسی کے نفاذ کے بعد، حکام نے 1000 قیدیوں کو رہا کر دیا۔ چیف جسٹس چودھری کی ہدایت پر، جب انھوں نے پورے ملک میں جیلوں کا دورہ کیا، پنجاب کے ہوم ڈپارٹمنٹ نے صوبہ بھر کی 29 جیلوں میں 32,464 قیدیوں کا طبّی معائنہ کرایا۔

سال کے دوران جیلوں میں فسادات کی مختلف رپورٹیں ملیں۔ The News نے جیل کے حکام کا حوالہ دیا جنھوں نے بتایا کہ سندھ میں اس سال کے دوران 20 سے زیادہ فسادات ہوئے تھے۔ جن شکایتوں کی وجہ سے یہ فسادات ہوئے ان میں جیلوں میں ہجوم، قانونی حقوق سے محرومی، کیسوں کا فیصلہ ہونے میں سست روی، جیل انتظامیہ کا رویہ اور سہولیات کا فقدان شامل تھیں

سال کے اختتام تک سندھ کے اٹارنی جنرل نے اپنے اس وعدے پر عمل نہیں کیا تھا کہ حیدرآباد سینٹرل جیل میں اکتوبر 2008 ء میں قیدیوں کے ساتھ پولیس کی بدسلوکی کی تفتیش کرائی جائے گی۔ یہ فساد قیدیوں کی طرف سے بنیادی سہولتوں کے فقدان، اور مبینہ کرپشن کی وجہ سے ہوا تھا۔ 1000 سے زیادہ قیدی اپنی کوٹھریوں سے نکل آئے اور انھوں نے 40 قیدیوں کو قید تنہائی میں رکھنے اور قید کے بنیادی حالات پر احتجاج کیا۔ پولیس نے جھڑپوں میں چار قیدیوں کو زخمی کر دیا۔

جیلوں کے عہدے داروں نے نابالغ مجرموں کو انہیں عمارتوں میں، لیکن علیحدہ بیرکوں میں رکھا، جن میں بالغ قیدی رکھے گئے تھے۔ پولیس نے اکثر زیرِ حراست ملزموں کو سزا یافتہ مجرموں سے الگ نہیں رکھا۔ ذہنی بیماریوں والے قیدیوں کو اکثر دیکھ بھال کی کافی سہولتیں فراہم نہیں کی گئیں، اور انہیں جیلوں میں قید عام قیدیوں سے علیحدہ نہیں کیا گیا۔

2005 میں حکام نے عورتوں کے خصوصی پولیس اسٹیشنوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ ان پولیس اسٹیشنوں کا عملہ مکمل طور سے خواتین پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کا قیام آبروریزی سمیت، زیرِ حراست عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی شکایتوں کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا۔ عورت فاؤنڈیشن نے اطلاع دی کہ وسائل کی کمی اور پولیس میں کام کرنے والی خواتین کی مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے، ان پولیس اسٹیشنوں نے ٹھیک سے کام نہیں کیا۔ عدالتوں کے احکام اور ضابطوں کے تحت، مرد پولیس افسروں کو مشتبہ خواتین کے ساتھ رابطہ کرنے کی ممانعت ہے، لیکن مرد پولیس افسروں نے اکثر خواتین کو حراست میں لیا اور عام پولیس اسٹیشنوں میں ان سے پوچھ گچھ کی۔

اگرچہ قانون میں ایسی شقیں موجود ہیں جن کے تحت قیدیوں کو پروبیشن پر رہا کیا جا سکتا ہے، لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے بیشتر کیسوں میں اس طریقے کا استعمال ناممکن رہا۔

انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس (ICRC) کا حکام کے ساتھ معاہدہ تھا کہ انہیں آزادانہ طور پر پورے ملک کی جیلوں کے دوروں کی اجازت دے دی جائے گی، لیکن اس مفاہمت کو صرف جزوی طور پر پورا کیا گیا۔ ICRC کو پشاور سینٹرل جیل تک رسائی ملی جہاں اس نے پانی کی صفائی میں بہتری کا ایک منصوبہ شروع کیا۔ ICRC کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حراست کے بعض مقامات کے دوروں کی اجازت نہیں دی گئی۔ ICRC نے 2008 میں پنجاب میں جیلوں کے دورے معطل کر دیے کیوں کہ اس کے انسپکٹروں کو بعض ایسے قیدیوں تک رسائی کی اجازت نہیں دی گئی جنہیں سیکورٹی سے متعلق الزامات میں قید کیا گیا تھا۔ حکام نے مقامی، صوبائی، یا قومی سطح پر انسانی حقوق کے بعض گروپوں اور صحافیوں کو جیلوں میں نابالغوں اور خواتین قیدیوں کے حالات کی نگرانی کی اجازت دی، لیکن جیلوں میں مرد قیدیوں کے حالات دیکھنے کے لیئے کے، جو عام طور سے سب سے زیادہ خراب ہوتے ہیں، دوروں کی اجازت شاذ و نادر اور عارضی طور پر ہی ملی۔

d۔ بلاجواز گرفتاری یا حراست

قانون کے تحت بلاجواز گرفتاری یا حراست ممنوع ہے، لیکن حکام نے اس ہدایت پر ہمیشہ عمل نہیں کیا۔

پولیس اور سیکورٹی کی تنظیم کا رول

ملک کے بیشتر حصے کے لیئے داخلی سیکورٹی کی ذمہ داری پولیس کی ہے۔ 2006 کے Police Order (Second Amendment) Ordinance کے تحت، مقامی پولیس کا کنٹرول وزارتِ داخلہ کے پاس ہے۔ تاہم صوبائی حکومت کو افسروں کو ان کے عہدے سے تبادلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اور ڈسٹرکٹ ناظم {میئرز} ڈسٹرکٹ پولیس افسروں کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ لکھتے ہیں، جن کی بنیاد پر ان کی ترقی ہوتی ہے۔

فاٹا کے علاقے میں قانون اور امن عامہ کا انتظام FCR کے تحت پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے ہوتا ہے جو صوبہ سرحد کے گورنر کے توسط سے صدر کو رپورٹ کرتے ہیں۔ پولیس کی جگہ، فاٹا میں نفاذِ قانون کے کئی ادارے کام کرتے ہیں۔ ان میں مختلف قبائلی فورسز، نیم فوجی فرنٹیئر کور، جو زمانۂ امن میں وزارتِ داخلہ کو اور شورش کے زمانے میں فوج کو رپورٹ کرتی ہے؛ فرنٹیئر کانسٹبلری جو فاٹا اور صوبہ سرحد کے درمیانی علاقے میں پیٹرول کرتی ہے؛ لیویز، جو فاٹا کی بعض ایجنسیوں میں کام کرتی ہیں، اور پولیٹیکل ایجنٹ کو رپورٹ کرتی ہیں؛ خاصہ دار جو امن و امان قائم رکھنے میں پولیٹیکل ایجنٹ کی مدد کرتے ہیں؛ اور لشکر، یعنی قبائلی ملیشائیں شامل ہیں جنہیں قبائلی لیڈر قانون اور امن و امان کے عارضی مسائل سے نمٹنے کے لیئے جمع کرتے ہیں۔

رینجرز ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو وزارت داخلہ کے اختیار کے تحت کام کرتی ہے۔

مسلح افواج خارجی سیکورٹی کی ذمہ دار ہیں۔ اس سال کے دوران، بعض اوقات انہیں داخلی سیکورٹی کی ذمہ داریاں بھی تفویض کر دی گئی تھیں۔

پاکستان

پولیس میں کرپشن بہت زیادہ ہے۔ کم تنخواہوں اور کام کے خراب حالات کی وجہ سے، خاص طور سے نچلی سطح کے عہدے داروں، میں کرپشن کو فروغ ملتا ہے۔

یہ بات سب کے علم میں ہے کہ پولیس حقیقی شکایتوں کو درج کرنے کی فیس لیتی ہے، اور پیسہ لے کر جھوٹی شکایتیں درج کر لیتی ہے۔ الزامات سے بچنے کے لیئے رشوت دینا عام سی بات ہے۔ لوگ اپنے مخالفین کی بے عزتی کرانے اور ذاتی شکوے شکایتوں کا بدلہ لینے کے لیئے پولیس کو رشوت دیتے ہیں۔ ناقدین نے الزام لگایا ہے کہ اسٹیشن ہاؤس افسروں کا تقرر سیاسی بنیادوں پر ہونے لگا ہے۔

پولیس کی کارکردگی میں ڈسٹرکٹ کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ کہیں اس کی کارکردگی معقول حد تک ٹھیک ہے، اور کہیں وہ بالکل غیر موثر ہے۔ پولیس کے بعض ارکان انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے یا ان کا رویہ سیاسی مفادات کے تابع تھا۔ خلاف ورزیوں پر اکثر سزا نہ دینے سے دیدہ دلیری کا ماحول قائم ہو گیا۔ پولیس اور جیلوں کے عہدے داروں نے قیدیوں اور ان کے اہلِ خاندان سے پیسہ اینٹھنے کے لیئے اکثر بدسلوکی کی دھمکیوں کا سہارا لیا۔ انسپکٹرز جنرل، ضلعی پولیس افسر، ضلعی ناظم، صوبائی وزیر داخلہ یا وزرائے اعلیٰ، وفاقی وزیر داخلہ، وزیرِ اعظم، یا عدالتیں داخلی طور پر بدسلوکیوں کی تفتیش کا حکم دے سکتی ہیں، اور انتظامی سزاؤں کا حکم دے سکتی ہیں۔ انتظامی برانچ اور پولیس کے عہدے دار عدالتی کارروائی کی سفارش کر سکتے ہیں اور عدالتیں فوجداری مقدمہ چلانے کا حکم دے سکتی ہیں، اور یہ طریقے کبھی کبھی استعمال کیئے گئے ہیں۔

گذشتہ برسوں کی طرح، پنجاب کی صوبائی حکومت نے ہر سطح پر پولیس کے لیئے ٹیکنکل مہارتوں اور انسانی حقوق کی حفاظت کی تربیت کے اور دوبارہ تربیت کے پروگرام منعقد کیئے۔ اطلاع کے مطابق، کراچی شہر کی حکومت نے شہر کے انسانی حقوق کے افسروں کو تربیت کی سہولتیں فراہم کیں۔ سال کے دوران، کم از کم دو غیر سرکاری تنظیموں، (Sahil and SHARP) نے پولیس افسروں کو تربیت دی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں، SHARP کے مطابق، پبلک سیفٹی کمیشن کی کارکردگی مسلسل خراب رہی کیوں کہ ان کا دائرہ کار مبہم تھا، اور انٹر نیشنل کرائسس گروپ (ICG) کے مطابق، صوبائی انتظامیہ کی طرف سے ان کے کام میں مداخلت کا امکان موجود تھا۔ اگرچہ پنجاب، سندھ، اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کے بیشتر ضلعوں میں ڈسٹرکٹ پبلک سیفٹی کمیٹیاں موجود تھیں، ان کی کارکردگی اور افادیت کو ناکافی عملے کی وجہ سے نقصان پہنچا۔ ICG نے یہ اطلاع بھی دی کہ یہ کمیٹیاں سیاسی اثر ورسوخ کے زیر اثر تھیں۔

پولیس اکثر مذہبی اقلیتوں کو، جن میں عیسائی، احمدی، اور شیعہ شامل ہیں، معاشرے کے بعض عناصر کے حملوں سے بچانے میں ناکام رہی۔

گرفتاری کا طریقہء کار اور حراست کے دوران سلوک

فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (FIR) کسی بھی گرفتاری کی قانونی بنیاد ہوتی ہے۔ جب شکایت کنندہ اس بات کا معقول ثبوت پیش کرے کہ کسی جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے، تو پولیس FIR کی کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ ایف آئی آر کے تحت پولیس اس شخص کو جس پر شبہے کا اظہار کیا گیا ہے، 24 گھنٹے تک اپنی تحویل میں رکھ سکتی ہے۔ اس کے بعد صرف مجسٹریٹ ہی مزید 14 روز تک مشتبہ شخص کو حراست میں رکھنے کا حکم دے سکتا ہے، اگر پولیس یہ ثابت کرے کہ اس قسم کی حراست تفتیش کے لیئے ضروری ہے۔ عملی طور پر، حکام نے حراست کے بارے میں ان حدود کی پوری طرح پابندی نہیں کی۔ حکام نے اکثر مزید کسی اضافی شہادت کے بغیر ایف آئی آر جاری کر دیں تا کہ زیر حراست فرد کو پریشان یا خوفزدہ کیا جا سکے، یا انھوں نے کافی شہادت کے باوجود ایف آئی آر جاری نہیں کیں جب تک کہ شکایت کنندہ نے رشوت ادا نہ کر دی۔ بعض اوقات پولیس نے افراد کو کوئی الزام

لگائے بغیر یا جھوٹے الزامات لگا کر حراست میں لے لیا تاکہ ان کی رہائی کے لیئے پیسہ اینٹھا جاسکے۔ پولیس نے مطلوبہ افراد کے رشتے داروں کو حراست میں لے لیا تاکہ مشتبہ افراد خود کو پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

پولیس نے عام طور سے تفتیش کے لیئے لوگوں کو زیر حراست رکھنے کے لیئے مجسٹریٹ کی منظوری نہیں لی اور زیر حراست افراد کو کوئی الزام لگائے بغیر اس وقت تک حراست میں رکھا جب تک کسی عدالت نے حراست کو چیلنج نہ کیا۔ حراست کے دوران بعض عورتوں کے ساتھ جنسی طور پر زیادتی کی گئی۔ درخواست کیئے جانے پر، مجسٹریٹوں نے عموماً اس بات کا تعین کیئے بغیر کہ حراست کی ضرورت ہے یا نہیں، تفتیشی حراست کی منظوری دے دی۔ ایسے کیسوں میں جب ثبوت ناکافی تھا، پولیس اور مجسٹریٹ نے بعض اوقات ملی بھگت سے نئی ایف آئی آر جاری کر دیں تاکہ حراست کو 14 روز کی زیادہ سے زیادہ قانونی حد سے بڑھایا جاسکے۔

عدالتوں نے نادار ملزموں کے لیئے صرف ایسے کیسوں میں وکیل مقرر کیئے جن کی سزا موت ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو کسی قیدی سے ملنے کے لیئے اکثر رشوتیں دینا پڑیں۔ غیر ملکی سفارتکار عدالت میں حاضری کی صورت میں قیدیوں سے مل سکتے تھے، اور عموماً اپنے ملک کے شہریوں سے جیل جا کر مل سکتے تھے۔

ڈسٹرکٹ کوآرڈینیشن افسر 90 دن تک کے لیئے حفاظتی حراست کا حکم دے سکتے ہیں، اور عدالت کی منظوری سے حراست کی مدت میں مزید 90 دن کی توسیع ہو سکتی ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے الزام لگایا ہے کہ کئی افراد کو جو مبینہ طور پر دہشت گرد تنظیموں سے وابستہ تھے، غیر معینہ عرصے کے لیئے حفاظتی حراست میں رکھا گیا۔ کرپشن کے کیسوں میں، احتساب کا قومی بیورو (NAB)، مشتبہ افراد کو غیر معینہ عرصے کے لیئے حراست میں رکھ سکتا ہے بشرطیکہ ہر پندرہ روز بعد عدالت سے رضامندی حاصل کر لی جائے۔ سال کے دوران، NAB نے شاذ و نادر ہی اس اختیار کو استعمال کیا۔

قانون میں صراحت کی گئی ہے کہ حراست میں لیئے گئے افراد پر ان کی گرفتاری کے 30 دنوں کے اندر مقدمہ چلایا جائے۔ حدود آرڈیننس اور عام فوجداری قانون، دونوں کے تحت قابلِ ضمانت اور ناقابلِ ضمانت جرائم ہیں۔ قابلِ ضمانت جرائم کے لیئے مقدمہ چلنے تک ضمانت دی جانی ضروری ہے، اور ایسے ناقابلِ ضمانت جرائم کے لیئے جن کی سزا دس سال سے کم ہوتی ہے، عدالت کی صوابدید پر ضمانت کی اجازت ہے۔ عملی طور پر، ججوں نے پولیس یا کمیونٹی کی درخواست پر، یا رشوت کی ادائیگی پر ضمانت کی درخواست نامنظور کر دی۔ بہت سے کیسوں میں، الزامات عائد کیے جانے کے تقریباً چھ مہینے بعد تک مقدمے شروع نہیں ہوئے، اور بعض کیسوں میں، افراد کی مقدمے سے پہلے کی حراست کی مدت اُس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا کی مدت سے بھی زیادہ تھی جس کا الزام ان پر عائد کیا گیا تھا۔ SHARP نے اندازہ لگایا ہے کہ جیلوں میں جو لوگ بند ہیں ان میں تقریباً 55 فیصد لوگ مقدمہ چلنے کے انتظار میں ہیں۔

10 مارچ اور 12 مارچ کے دوران، سیکیورٹی فورسز نے پاکستان مسلم لیگ—نواز گروپ (PML-N) کے 400 ارکان کو گرفتار کر لیا تاکہ احتجاج کرنے والوں کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، افتخار محمد چودھری کی بحالی کی حمایت کے لیئے مارچ میں شرکت کرنے اور دھرنا دینے سے روکا جا سکے۔ انھیں اس وقت کے صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف، مشرف نے 2007ء میں برطرف کر دیا تھا۔ 14 مارچ کی رات اور 15 مارچ کی صبح کو حکام نے نواز شریف، اعتزاز احسن، اور دوسرے کئی سیاسی لیڈروں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ بظاہر یہ پابندی خود ان کی حفاظت کے لیئے لگائی گئی تھی۔ لیکن جب ان سیاسی لیڈروں نے 15 مارچ کی سہ پہر کو ان پابندیوں کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا تو حکام نے ان پابندیوں پر عمل درآمد نہیں کیا۔ HRW کے مطابق، پنجاب اور سندھ کی صوبائی حکومتوں نے ضابطہء فوجداری کی دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا جس کے تحت چار یا

پاکستان

اس سے زیادہ افراد کا اجتماع ممنوع ہے۔ HRW سمیت انسانی حقوق کی تنظیموں نے، گرفتاریوں اور اجتماعات پر پابندیوں کے خلاف سخت تنقید کی۔ حکام نے پاکستان مسلم لیگ۔ نواز کے کارکنوں کو 15 مارچ کی شام کو وزیرِ اعظم کے اس اعلان کے بعد رہا کر دیا کہ ملک بھر سے دفعہ 144 اٹھائی جا رہی ہے اور تمام سیاسی قیدی رہا کیئے جا رہے ہیں۔

فاٹا میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت، پولیٹیکل ایجنٹوں کو اجتماعی سزا عائد کرنے، احتیاطی تدبیر کے طور پر افراد کو تین سال تک زیرِ حراست رکھنے، اور ناپسندیدہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیئے "بانڈز" طلب کرنے کا حق حاصل ہے۔ حکام نے مفرور قبائل کے ارکان کو حراست میں لینے، ان کے گھروں کو مسمار کرنے، قبائلی علاقوں اور ملک کے دوسرے حصوں میں ان کی املاک کو ضبط یا تباہ کرنے، یا جب تک کوئی مفرور ملزم خود کو حکام کے حوالے نہ کر دے، یا مقامی رواج کے مطابق خود اس کا قبیلہ اسے سزا نہ دے دے، اس کے گاؤں کا محاصرہ کرنے کے لیئے اجتماعی ذمہ داری کا حوالہ دیا۔ اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹس جن کے کام کی نگرانی پولیٹیکل ایجنٹس کرتے ہیں اور جنھیں اپنی مرضی کے قبائلی عمائدین سے مدد لینے کا اختیار ہے، فاٹا کے علاقے میں قانونی اعتبار سے انصاف کے ذمہ دار ہیں اور وہ اسلامی قانون اور قبائلی رواج کے مطابق سماعتیں منعقد کرتے ہیں۔ فوجی کارروائیوں، عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں، اور علاقے میں سیکیورٹی کی خراب صورتِ حال کی وجہ سے ان کی عدالتی کارروائی کرنے کی صلاحیت کو نقصان پہنچا ہے۔ عام طور سے جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ جرمانوں اور 14 برس تک قید پر مشتمل ہوتی ہیں، ملزمان کو کسی وکیل کی خدمات یا ضمانت کا حق نہیں ہوتا۔ فاٹا میں، اور ایک مختصر عرصے کے لیئے سوات میں، عسکریت پسندوں نے عارضی عدالتوں میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، شریعت کے قانون کا نفاذ کیا؛ ان کی دی ہوئی سزاؤں میں، سرِ عام سر قلم کیا جانا، سنگساری، کوڑے اور جرمانے شامل تھے (سیکشن 1.g. دیکھئے)۔

NAB یا انسدادِ دہشت گردی کی عدالتوں کے سامنے جو کیس پیش کیئے جاتے ہیں، ان پر خصوصی ضابطوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ NAB کے کیسوں میں مشتبہ افراد کو کوئی الزام لگائے بغیر 15 دن تک حراست میں رکھا جا سکتا ہے (عدالت کی رضامندی سے اس کی تجدید ہو سکتی ہے)، اور فردِ جرم عائد ہونے سے پہلے، ملزم کو وکیل تک رسائی سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ NAB نے فوج یا عدلیہ میں کام کرنے والے ارکان پر مقدمہ نہیں چلایا۔ اس سال کے دوران، حکومت نے NAB کا نئے الزامات کی بنیاد پر سیاست دانوں پر مقدمہ چلانے کا اختیار ختم کر دیا۔

احتساب کی عدالتیں ضمانت منظور نہیں کر سکتیں؛ صرف NAB کے چیئرمین کو یہ طے کرنے کا اختیار حاصل ہے کہ زیرِ حراست فرد کو رہا کیا جائے یا نہیں اور کب رہا کیا جائے۔ احتسابی عدالتیں NAB آرڈیننس کے تحت 1999ء میں کرپشن کے کیسوں کے لئے قائم کی گئی تھیں۔ اکیس احتساب عدالتیں NAB کے دائرہ اختیار کے باہر کام کرتی ہیں۔ ان کے انتظامی امور اور روزمرہ کے کام ہائی کورٹس کے کنٹرول میں ہیں۔ انسداد دہشت گردی کی عدالتیں ضمانت منظور نہیں کرتیں اگر عدالتوں کے پاس یہ سمجھنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ ملزم نے جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ سیکورٹی فورسز، عدالتوں کی منظوری کے بغیر، دہشت گردی کے مشتبہ ملزموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا سکتی ہیں، ان کے اثاثوں پر قبضہ کر سکتی ہیں، اور کوئی الزام لگائے بغیر ایک سال تک حراست میں رکھ سکتی ہیں۔

16 دسمبر کو، سپریم کورٹ نے 2007 کے NRO کو، جسے اس وقت کے صدر مشرف نے نافذ کیا تھا، منسوخ اور غیر موثر قرار دے دیا۔ اس قانون میں عوامی عہدے رکھنے والے ایسے لوگوں کو جن پر الزامات لگائے گئے تھے لیکن جنھیں مجرم قرار نہیں دیا گیا تھا، معافی دینے کا طریقہ کار فراہم کیا گیا تھا۔ یہ قانون 1986ء اور 1999ء کے درمیان درج کیئے جانے والے کیسوں کے بارے میں تھا۔

پاکستان

مئی 2008 میں حکومت نے اعلان کیا کہ سزائے موت پر عمل درآمد معطل کر دیا گیا ہے، اگرچہ عملی طور پر ایسا نہیں کیا گیا۔ مارچ 2008ء میں HRCP نے کہا کہ اس بات کی قوی شہادت موجود ہے کہ قانون کے تقاضے پورے کیئے بغیر سزائے موت پر عمل کیا گیا ہے، اور SHARP نے اطلاع دی کہ اندازاً سات ہزار قیدی سزائے موت کے منتظر ہیں۔ اگست میں صدر زرداری نے ایک حکم جاری کیا جس کے تحت "انٹرنیٹ کے جرائم" پر پھانسی یا عمر قید کی سزا دی جا سکتی ہے، اگر اس قسم کے جُرم کے نتیجے میں کسی فرد کی موت واقع ہوئی ہو؛ اس حکم کے ذریعے ایسے جرائم کی تعداد جن پر سزائے موت دی جا سکتی ہے، 28 ہو گئی۔

9 جولائی کو حکام نے Center for Legal Aid Assistance and Settlement (CLAAS) کے قومی ڈائریکٹر، Joseph Francis کو گرفتار کر لیا، اور جب انھوں نے ضمانت کی مدت کے دوران، جبری تبدیلیٔ مذہب کے ایک کیس میں لندن کا سفر کیا، تو اس کے بعد ان کی ضمانت کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔ کرسچیئن اسٹڈی سینٹر کے مطابق، حکام نے فرانسس کو رہا کرنے سے پہلے ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک حراست میں رکھا۔

e۔ کھلے عام منصفانہ مقدمے سے محروم کیا جانا

قانون میں کہا گیا ہے کہ عدلیہ غیر جانب دار ہو گی۔ عملی طور پر عدلیہ پر خارجی اثرات جیسے مقامی سطح پر سڑکوں پر مظاہروں کے اثرات پڑتے رہے۔ غیر سیاسی کیسوں میں، میڈیا اور عوام نے عام طور سے ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کو قابلِ اعتبار سمجھا۔ مارچ میں وکلاء کی تحریک کے بڑے پیمانے پر مظاہروں کے بعد، اور پاکستان مسلم لیگ۔ نواز پارٹی کے دباو کی وجہ سے، وزیر اعظم گیلانی نے افتخار چودھری کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ گیلانی نے سپریم کورٹ اور صوبائی ہائی کورٹس کے دس دوسرے ججوں کو بھی بحال کیا۔ یہ اقدام کرتے ہوئے وزیرِ اعظم نے ان تمام ججوں کو جنہیں اس وقت کے صدر مشرف نے 2007ء میں برطرف کیا تھا اور جو رٹائرمنٹ کی عمر کو نہیں پہنچے تھے، ان کے عہدوں پر بحال کر دیا۔ چیف جسٹس چودھری نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ان تمام ججوں کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جنھوں نے 2007ء میں مشرف کے عبوری آئینی آرڈر کے تحت حلف اٹھایا تھا۔

اعلیٰ عدلیہ جسے حال ہی میں بحال کیا گیا ہے حکومت کی انتظامی شاخ کے اثر سے آزاد ہے لیکن اس نے بعض مشہور کیسوں میں جو فیصلے دیے ہیں ان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیاست کے زیر اثر ہے اور حزبِ اختلاف کی طرفدار ہے۔

دیوانی اور فوجداری مقدموں میں تاخیر کی وجوہات میں طریقہ کار کے دقیانوسی ضابطے، مقدموں کے انتظام کے کمزور نظام، عدالتی نظام میں کیس کو آگے بڑھانے کے لیئے مقدمے بازی کے اخراجات، اور قانون کی ناقص تعلیم شامل ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے شکایات کے موثر حل کے حق، اور منصفانہ اور کھلے عام سماعت کے حق کو نقصان پہنچتا ہے۔

ملک میں بیک وقت کئی عدالتی نظام رائج ہیں جن میں سے بعض کا دائرہ اختیار ایک جیسا ہے اور کبھی کبھی ان کے درمیان مقابلے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے: فوجداری؛ دیوانی اور شخصی حیثیت؛ دہشت گردی؛ کاروباری؛ خاندانی؛ فوجی اور شرعی قانون۔ آئین کی دفعہ 203 کے مطابق، وفاقی شریعت کورٹ اپیل سننے والی عدالت ہے جو قوانین کی جانچ کر سکتی ہے اور یہ فیصلہ کر سکتی ہے کی کیا کوئی قانون اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے ۔ The Women's Protection Act کی منظوری سے اس امکان کی نفی نہیں ہوتی کہ وفاقی شرعی عدالت بعض کیسوں میں اپیل سُن سکتی ہے

۔ وفاقی شریعت کورٹ ایسے کیسوں کی اپیل سن سکتی ہے جن کا تعلق حدود آرڈیننس کے بعض ایسے حصوں سے ہو جنہیں قانون کی سیکیولر شقوں میں منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں جوا کھیلنا، اپنے پاس شراب رکھنا، شراب پینا، اور شادی کے جھوٹے وعدے پر مباشرت کرنا شامل ہیں۔

قومی اسمبلی 1952 کے آرمی ایکٹ میں کی گئی ترامیم کو، جن کے تحت سویلین باشندوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کی اجازت دی گئی تھی، سپریم کورٹ کی طرف سے عائد کردہ ڈیڈ لائن سے پہلے منظور نہ کر سکی۔ اس طرح یہ ترمیمات کالعدم ہو گئیں۔ قومی اسمبلی 1973 کے Legal Practitioners and Bar Councils Act میں کی گئی ترامیم کو جن کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ وکیلوں کی انجمنوں کی آزادی کو محدود کر دیا جائے، سپریم کورٹ کی طرف سے عائد کردہ ڈیڈ لائن سے پہلے منظور نہ کر سکی۔ اس طرح یہ ترمیمات کالعدم ہو گئیں۔ ترمیمات کے ان دونوں مجموعوں کو 2007ء کی ہنگامی حالت میں سابق صدر مشرف کے احکامات کے ذریعے منظور کیا گیا تھا، اور یہ 28 نومبر کو کالعدم ہو گئیں۔ کالعدم ہونے سے پہلے ان میں سے کسی کو بھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

نچلی سطح کی عدالتوں میں بد عنوانیوں اور خراب کارکردگی کا دور دورہ رہا اور وہ ممتاز مالدار، مذہبی اور سیاسی افراد کے زیر اثر رہیں۔ عدلیہ میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ترقیاں ہونے سے، عدالتی نظام پر حکومت کے کنٹرول میں اضافہ ہو گیا۔ ججوں کی خالی اسامیوں اور عدالتوں کے ناقص اور غیر موثر ضابطوں کے نتیجے میں ایسے مقدموں اور اپیلوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا جن پر کارروائی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔

زیریں اور اعلیٰ عدالتوں، دونوں میں ناتمام کیسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ عدلیہ کی قومی پالیسی پر پاکستان کے Law and Justice Commission کی 2009ء کی شائع شدہ رپورٹ کے مطابق، اعلیٰ سطح کی عدالتوں میں 138,945 کیسوں پر کارروائی مکمل نہیں ہوئی تھی اور زیریں یا ماتحت عدالتوں میں نامکمل کیسوں کی تعداد 1,565,926 تھی۔

سندھ اور پنجاب میں جاگیر دار اور زمیندار، اور پشتون اور بلوچ علاقوں میں قبائلی سردار مقامی کونسل کی میٹنگیں کرتے رہے (انہیں پنچایت یا جرگہ کہا جاتا ہے)۔ بعض اوقات ان کونسلوں کے انعقاد سے مروجہ قانونی نظام کی خلاف ورزی ہوئی۔ ان کونسلوں میں، جو خاص طور سے دیہی علاقوں میں عام ہیں، پرانی عداوتوں کا تصفیہ کیا جاتا ہے، اور جس شخص کو مجرم سمجھا جاتا ہے اسے قبائلی رواج کے مطابق سزائیں دی جاتی ہیں جن میں جرمانے، قید، یہاں تک کہ موت کی سزا بھی شامل ہے۔ پشتون علاقوں میں، یہ کونسلیں پشتون قبائلی قانون کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس قانون کے مطابق، ایک فرد، اس کے گھرانے، اور اس کے قبیلے پر لازم ہے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی حقیقی ناانصافی ہوئی ہے یا اگر یہ تاثر ہے کہ اس کے زیادتی کی گئی ہے تو وہ اپنی عزت کی بحالی کے لیئے بدلہ لے۔ اس قسم کے جھگڑے اکثر عورتوں اور زمین کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور ان میں عام طور سے تشدد ہوتا ہے۔

قبائلی علاقوں میں روایتی طور پر خاندانی عداوتوں، خاص طور سے قتل کے واقعات کا تصفیہ اس طرح ہوتا ہے کہ ملزم اپنی بیٹیوں کی شادی اس شخص سے کر دیتا ہے جس کے اقدام سے اسے تکلیف پہنچی تھی۔

بہت سی قبائلی کونسلوں نے سزائے موت جیسی انتہائی سخت سزاؤں پر عمل کیا یا وٹے سٹے کی شادیوں کا فیصلہ دیا (کنبے یا قبیلے کے درمیان ادلے بدلے کی شادی)۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران، ایسی اطلاعات میں اضافہ ہوا ہے کہ کئی قبائلی ایجنسیوں میں اور ایک مختصر عرصے کے لیئے سوات میں،

عسکریت پسندوں نے خود اپنی عدالتیں قائم کر لی ہیں اور کسی قانونی طریقہ کار کے بغیر یا اپنے غور و خوض کو شفاف انداز سے عام کیئے بغیر، فوری فیصلہ دے دیا ہے۔

AHRC نے اطلاع دی ہے کہ 2002 سے اب تک ملک میں 4,000 سے زیادہ افراد کو جرگہ عدالتوں کے حکم سے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ان میں دو تہائی عورتیں تھیں۔ اگرچہ اعلیٰ عدالتوں نے ان فیصلوں کو غیر قانونی قرار دیا ہے، لیکن AHRC نے اطلاع دی ہے کہ جرگوں کے فیصلوں پر عمل درآمد میں ملوث کچھ لوگ پارلیمینٹ کے رکن ہیں۔

15 فروری کو قومی اسمبلی نے مالاکنڈ ڈویژن میں، تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی (TNSM) کے ساتھ ایک متنازع امن سمجھوتے کی توثیق کر دی۔ اس سمجھوتے کے تحت حکومت نے مالاکنڈ ڈویژن کے لیئے عدالتی نظام میں کچھ تبدیلیاں کیں جن کا خاص مقصد یہ تھا کہ تیزی سے انصاف مہیا کیا جائے۔ اس کے بدلے، TNSM نے ڈویژن میں عسکریت پسندی کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی ضمانت دی۔ بہت سے لوگوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ TNSM کو نئی عدالتوں کے جج جنہیں قاضی کہا جاتا ہے، مقرر کرنے پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا، اگرچہ حکومت نے بار بار کہا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے قبل کے عدلیہ کے لیئے عملے کا تقرر ہوتا، عسکریت پسندوں نے امن سمجھوتے کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے اپنی سرگرمیاں مالاکنڈ ڈویژن کے زیادہ بڑے حصے پر پھیلا دیں۔ اس کے جواب میں، حکومت نے اعلان کر دیا کہ امن سمجھوتہ ٹوٹ گیا ہے، اور اس نے اپریل میں فوجی آپریشن شروع کر دیا تاکہ عسکریت پسندوں کو وہاں سے نکالا جا سکے اور علاقے پر اپنا کنٹرول دوبارہ بحال کیا جا سکے۔ حکومت نے مالاکنڈ ڈویژن میں نئے تیز رفتار نظامِ انصاف کو منسوخ نہیں کیا لیکن TNSM یا کسی اور انتہا پسند گروپ سے مشورہ کیئے بغیر، نئی عدالتوں کے لیئے ایسے جج مقرر کر دیے جن کا سب احترام کرتے ہیں۔

اپریل میں ملٹری آپریشن شروع ہونے سے پہلے، مالاکنڈ ڈویژن میں عسکریت پسندوں نے اپنے برانڈ کا اسلامی نظامِ انصاف قائم کر دیا تھا۔ مارچ میں، قومی اور بین الاقوامی میڈیا کے ذرائع پر ایک وڈیو جاری کیا گیا جس میں عسکریت پسندوں کو ایک نوجوان لڑکی کو سوات میں کوڑے مارتے دکھایا گیا تھا۔ پریس کے مطابق یہ اس جرم کی سزا تھی کہ لڑکی بازار میں ایک ایسے مرد کے ساتھ دیکھی گئی تھی جو اس کا شوہر نہیں تھا۔ عسکریت پسندوں کے ایک ترجمان نے اپنے اس حق کا دفاع کیا کہ خریداری کے لیئے بازار جانے والی عورتیں اگر نامناسب انداز کے کپڑے پہنے ہوں، تو اسلامی قانون کے تحت انہیں ایسی عورتوں کو کوڑے مارنے کی اجازت ہے۔ اس وڈیو کے اجرا سے مالاکنڈ ڈویژن میں عسکریت پسندوں کے خلاف قومی سطح پر تحریک شروع ہونے میں مدد ملی۔

مقدموں کا طریقہء کار

دیوانی، فوجداری اور خاندانی امور کے عدالتی نظام کے تحت مقدمے کھلی عدالت میں چلتے ہیں، جرم ثابت ہونے تک ملزم کو بے گناہ سمجھا جاتا ہے، وکیل کو جرح کرنے کا حق ہے، اور سزاؤں کی اپیل ہوتی ہے۔ مقدمے جیوری کے ذریعے نہیں چلائے جاتے۔ ملزموں کو مقدمے میں موجود ہونے اور وکیل سے مشورہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ زیریں عدالتوں میں قانونی پیروی کے اخراجات ملزموں کو برداشت کرنے ہوتے ہیں، لیکن سیشن کورٹ اور اپیل کی عدالتوں میں سرکاری خرچ پر وکیل فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ملزمان اپنے خلاف پیش کیئے جانے والے گواہوں پر جرح کر سکتے ہیں اور اپنے موقف کی حمایت میں گواہ/ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ملزمان اور ان کے وکیلوں کو ان کے مقدمے سے متعلق قانونی طور پر ایسی شہادت تک رسائی کا حق حاصل ہے جو حکومت کے پاس موجود ہے۔ ججوں کی شدید قلّت، تکمیل طلب کیسوں کی بھاری تعداد، طول طویل عدالتی ضابطوں،

پاکستان

بار بار کے التوا، اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے مقدموں کا فیصلہ ہونے میں عموماً کئی سال لگے، اور ملزمان کو بار بار عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ جب کوئی وکیل تبدیل ہوتا ہے تو کیس از سرِ نو شروع ہوتا ہے۔

The Anti-Terrorism Act کے تحت حکومت کو تیزی سے کام کرنے والی خصوصی عدالتیں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ ان عدالتوں میں ایسے لوگوں پر مقدمے چلائے جاتے ہیں جن پر پُر تشدد جرائم، دہشت گردی کی سرگرمیوں، مذہبی منافرت پھیلانے والی کارروائیوں یا تقریروں، اور مملکت کے خلاف جرائم کے الزامات ہیں۔ ایسی عدالتوں کے سامنے لائے جانے والے مقدمات کا فیصلہ کام کے سات دنوں کے اندر کیا جانا ضروری ہے، لیکن جج اپنی صوابدید پر اس مدت میں توسیع کے مجاز ہیں۔ عام ضابطوں کے تحت، ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں ہائی کورٹس یا سپریم کورٹ سنتی ہے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں نے اس تیز رفتار متوازی سسٹم پر تنقید کی ہے اور الزام لگایا ہے کہ اس میں سیاسی ہیرا پھیری کا خطرہ زیادہ ہے۔

عدالتیں عموماً مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے میں ناکام رہیں۔ ججوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ اگر یہ محسوس کیا جائے کہ قدامت پسند سنیوں کے خلاف کوئی جرم کیا گیا ہے، تو سخت کارروائی کی جائے۔ عدلیہ نے شاذ و نادر ہی مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی سلوک کے بارے میں کیسوں کی سماعت کی۔

وہ قوانین جن کے تحت توہینِ مذہب کی ممانعت ہے، عیسائیوں، احمدیوں، اور مسلمانوں سمیت دوسرے مذہبی گروپوں کے خلاف استعمال کیئے جاتے رہے۔ زیریں عدالتوں نے اکثر توہینِ رسالت اور توہینِ مذہب کے کیسوں میں کافی ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی جس کے نتیجے میں بعض ملزموں اور سزا پانے والے افراد کو برسوں جیل میں گذارنے پڑے، اس سے پہلے کہ اعلیٰ عدالتوں نے بالآخر ان کی سزایابی کے خلاف فیصلہ دیا اور ان کی رہائی کا حکم دیا۔

مقدموں کی ابتدائی عدالتوں نے عموماً توہینِ مذہب کے کیسوں میں ضمانت منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ملزموں کو سزائے موت دی جا سکتی ہے، اس لیئے ان کے فرار ہونے کا امکان ہے۔ بہت سے ملزموں نے ضمانت نہ دیے جانے کے فیصلے کے خلاف اپیل کی، لیکن مقدمہ شروع ہونے سے پہلے اکثر ضمانت منظور نہیں کی گئی۔ زیریں عدالتوں نے اکثر فیصلوں میں تاخیر کی، انہیں خوفزدہ کیے جانے کا سامنا کرنا پڑا، اور انھوں نے انتہا پسند عناصر کی طرف سے انتقامی کارروائی کے ڈر کی وجہ سے ضمانت منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

حدود کے ایسے تمام کیسوں میں جن میں دو سال قید سے زیادہ سزا دی جاتی ہے، وفاقی شرعی عدالت میں ابتدائی اپیل دائر کی جاتی ہے۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ ایسے کیسوں میں جن میں غلطی سے صوبائی ہائی کورٹ کسی حدود کیس میں اپیل سننے کا فیصلہ کر لیتی ہے، وفاقی شرعی عدالت کے پاس صوبائی ہائی کورٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

سپریم کورٹ کی شریعت بنچ، وفاقی شرعی عدالت کے کیسوں کے لیئے اپیل کی آخری عدالت ہے۔ 2005 کے ایک فیصلے میں مکمل سپریم کورٹ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ شریعت بنچ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اپیل کے ایسے کیسوں میں از خود اپنا دائرہ اختیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت ایسے قوانین کو کالعدم قرار دے سکتی ہے جو اس کی نظر میں اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے، لیکن ایسے کیسوں کی اپیل سپریم کورٹ کی شریعت بنچ سنتی ہے، اور بالآخر مکمل سپریم کورٹ ایسی اپیلیں سن سکتی ہے۔

پاکستان

فاٹا میں، فرنٹیئر کرائم ریگولیشن (FCR) کے تحت اجتماعی ذمے داری کے نظریے کو تسلیم کیا گیا ہے۔ فاٹا میں انصاف کی ذمہ داری قبائلی عمائدین کی ہے۔ انھوں نے مقدموں کی سماعت اسلامی قانون اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق کی۔ ان مقدموں میں ملزموں کو قانونی پیروی، ضمانت یا اپیل کا حق حاصل نہیں ہے۔ عام طور سے سزائیں جرمانوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ وفاقی سول ملازمین جو قبائلی ایجنسیوں میں تعینات ہوتے ہیں، مقدموں کی کارروائی پر نظر رکھتے ہیں، اور وہ 14 برس تک کی قید کی سزا عائد کر سکتے ہیں۔ FCR کے تحت، فاٹا میں رہنے والے لوگ مقدموں کے فیصلوں کی اپیل سول سرکاری ملازمین کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ بعض مبصرین نے ان ضابطوں پر تنقید کی ہے جن کے تحت عدلیہ کے سامنے مقدموں کی اپیلوں کی سماعت کی اجازت نہیں ہے۔

انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں نے اجتماعی ذمہ داری کے تصور کے بارے میں تشویش ظاہر کی ہے، کیوں کہ حکام نے اس تصور کو مفرور ملزموں کے قبیلے کے ارکان کو حراست میں لینے، ان کے گھروں کو مسمار کرنے، ان کی املاک کو ضبط یا تباہ کرنے، اور اس وقت تک مفرور ملزم کے گاؤں کا محاصرہ کرنے کے لیئے استعمال کیا ہے جب تک وہ خود کو حکام کے حوالے نہ کر دے یا اس کا اپنا قبیلہ مقامی رسم و رواج کے مطابق اسے سزا نہ دے دے۔

سال کے دوران فاٹا اور مالاکنڈ ڈویژن کے ان حصوں میں جو مذہبی انتہا پسندوں اور عسکریت پسندوں کے کنٹرول میں تھے، انھوں نے وہاں نظامِ انصاف سمیت متوازی انتظامیہ قائم رکھی۔ عسکریت پسندوں کے نظام انصاف کی انتظامیہ نے کوڑے مارنے اور پھانسی دینے سمیت، کھلے عام سزائیں دیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے (PATA) جو صوبائی انتظامیہ کے تحت ہیں، اور جن میں سوات، دیر، اور چترال کی پرانی ریاستوں کے کچھ حصے شامل ہیں، شرعی قانون کے تحت آتے ہیں۔ اس قانون کی شقوں کے تحت، جج جنہیں قاضی کہا جاتا ہے، مذہبی عالموں کی مدد سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ 15 فروری کو، حکومت نے اس طریقے کو پورے مالاکنڈ ڈویژن میں توسیع دے دی۔

آزاد کشمیر میں جو عدالتی نظام قائم ہے، وہ پورے ملک کی عدلیہ سے الگ ہے۔

گلگت۔بلتستان میں بھی (جسے ماضی میں شمالی علاقہ جات کہا جاتا تھا) ایک الگ عدالتی نظام کام کرتا ہے۔ The Gilgit-Baltistan Self Governance Order 2009 کے تحت علاقے کے لیئے علیحدہ عدلیہ، مجلس قانون ساز، اور انتخابی کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ ماضی میں، ملک کے قوانین کو وزارتِ کشمیر اور گلگت۔بلتستان کی صوابدید پر گلگت۔بلتستان کے علاقے تک توسیع دی جاتی تھی۔ گلگت۔بلتستان کی چیف کورٹ کے پاس ہائی کورٹ کے تمام اختیارات نہیں ہیں۔

سیاسی قیدی اور زیرِ حراست افراد

بعض سیاسی گروپوں نے دعویٰ کیا ہے کہ سیاسی وابستگیوں اور مذہبی عقائد کی بنا پر، ان کے ارکان کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

بلوچ قوم پرست اور سیاسی لیڈروں، اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق، ملٹری انٹیلی جنس اور سیکورٹی فورسز نے، صوبے میں 2004 میں ملٹری آپریشن شروع کرنے کے بعد سے اب تک، 1000 سے 1500 بلوچ سیاسی قیدیوں کو حراست میں لیا ہے۔ قیدیوں کی صحیح تعداد دستیاب

نہیں ہے کیوں کہ بہت سوں کو نا معلوم مقام پر رکھا گیا ہے۔ 2008 میں حکومت نے اعتراف کیا کہ گمشدہ افراد میں سے 1,100 اس کی تحویل میں ہیں، اور عام خیال یہی تھا کہ ان میں سینکڑوں سندھی اور بلوچ قوم پرست لیڈر اور سرگرم کارکن شامل ہیں (دیکھیئے سیکشن 1.b.)۔

حکام نے فروری 2008 میں لاہور میں چھ سرگرم طالب علم کارکنوں اور ایک ٹیچر پر حملے، گرفتاری اور حراست میں رکھنے کے سلسلے میں کسی کی جوابدہی کے لیئے کوئی اقدامات نہیں کیئے۔ اسی طرح مئی 2008 میں Chlam بلوچ کی گرفتاری، یا فروری 2008، میں منیر مینگل کی گرفتاری اور انھیں اذیتیں دینے والوں کی جوابدہی کے لیئے کچھ نہیں کیا۔

دیوانی عدالتی ضابطے اور شکایتوں کے ازالے کے طریقے

عام لوگ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لیئے ہائی کورٹس میں درخواست پیش کر سکتے ہیں، اور عدالتیں اکثر اس قسم کے اقدامات کرتی ہیں۔ عام لوگ زیادتیوں کے ازالے کے لیئے دیوانی عدالتوں میں سرکاری عہدے داروں کے خلاف درخواستیں پیش کر سکتے ہیں۔ ان میں دیوانی عدالتوں میں انسانی حقوق سے محروم کیئے جانے کی وجوہ بھی شامل ہیں۔ مبصرین نے اطلاع دی ہے کہ دیوانی عدالتوں نے شاید ہی کبھی ایسے کیسوں میں سرکاری طور پر فیصلے سنائے ہوں، اور بیشتر مقدموں کا تصفیہ عدالتوں کے باہر ہوا۔ اگرچہ انتظامی طور پر ناانصافیوں کے ازالے کے لیئے کوئی سرکاری طریقہ کار موجود نہیں ہیں، غیر سرکاری طور پر، ہرجانے کی رقم کی ادائیگی عام تھی۔

f۔ نجی امور، خاندان، گھر یا خط وکتابت میں غیر قانونی مداخلت

قانون کے تحت املاک کی تلاشی کے لیئے عدالت کی طرف سے جاری کیئے ہوئے وارنٹ ضروری ہیں۔ تاہم افراد کی تلاشی کے لیئے وارنٹ ضروری نہیں۔ پولیس نے عام طور سے اس قانونی ضرورت کو نظرانداز کیا اور بعض اوقات تلاشی کے دوران اشیاء چُرالیں۔ بہت کم ایسا ہوا کہ غیر قانونی طور پر داخل ہونے پر پولیس کو سزا دی گئی ہو۔ دہشت گردی کے انسداد کے ایکٹ کے تحت چلنے والے کیسوں میں، سیکورٹی فورسز کو کیس سے متعلق املاک کی، وارنٹ کے بغیر تلاشی لینے اور اس پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے۔

کئی ملکی انٹیلی جینس سروسز نے سیاست دانوں، سیاسی کارکنوں، مشتبہ دہشت گردوں، میڈیا اور مشتبہ غیر ملکی ایجنٹوں کی نگرانی کی۔ ان سروسز میں ISI، انٹیلی جینس بیورو، پولیس کی اسپیشل برانچ، اور ملٹری انٹیلی جینس شامل ہیں۔ سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود، قابلِ اعتبار رپورٹوں سے ظاہر ہوا کہ حکام نے عموماً لوگوں کے ٹیلیفون سننا اور عدالت کی منظوری کے بغیر، ڈاک کو روک کر اسے پڑھنا جاری رکھا۔ ان پر یہ شبہ بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ موبائل فون سنتے ہیں اور الیٹرانک خط وکتابت میں مداخلت کرتے اور اسے پڑھتے ہیں۔

1997 کے Anti-Terrorism Act کے مطابق، حکومت نے کئی مذہبی انتہا پسند اور دہشت گرد گروپوں کی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ بعض کالعدم گروپوں نے اپنے نام تبدیل کر لیئے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان میں جیشِ محمد (نیا نام: تحریک الفرقان اور الرحمت ٹرسٹ)؛ تحریکِ جعفریہ پاکستان (نیا نام: تحریکِ اسلامی پاکستان) اور سپہ صحابہ پاکستان (نیا نام ملتِ اسلامیہ پاکستان) شامل ہیں۔ بہت سے گروپ جنھوں نے اپنے نام بدل لیے تھے، بعد میں کالعدم قرار دیے دیے گئے۔ لشکرِ طیبہ نے خود کو نئے نام جماعت الدعوۃ کے نام سے دوبارہ منظّم کیا۔ حکومت نے، سلامتی کونسل کی قرارداد 1267 کے ردعمل میں جماعت کے پبلک اثاثوں پر قبضہ کر لیا اور اور اس کے اکاؤنٹس کو منجمد کرنے کا حکم دیا۔ اس

قرار داد میں جماعت الدعوۃ کو ایک دوسرے نام سے کام کرنے والی غیر ملکی دہشت گرد تنظیم قرار دیا تھا۔ 2008 میں حکومت نے تحریک طالبان پاکستان (TTP) کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا اور اسٹیٹ بنک کو اس تنظیم کے تمام اکاؤنٹس منجمد کرنے کا حکم دیا۔

اگرچہ حکومت نے عام طور سے شادی کرنے کے حق میں مداخلت نہیں کی، تاہم مقامی عہدے داروں نے بعض اوقات ایسی شادیوں کو روکنے میں جو خاندانوں کی مرضی کے خلاف تھیں، بااثر خاندانوں کی مدد کی۔ حکومت ایسے کیسوں میں سرگرمی سے عدالتی کارروائی کرنے میں بھی ناکام رہی جن میں خاندانوں نے ایسے افراد کو سزا دی { عموماً عورتوں کو } جنھوں نے خاندان کے دوسرے افراد کی مرضی کے خلاف شادی کی یا طلاق مانگی۔ مسلمان ہو جانے پر، عورتوں کی شادیاں جو ان کے پچھلے مذہب کی رسوم کے تحت ہوئی تھیں، کالعدم ہو گئیں، لیکن مردوں کی شادیاں، مذہب کی تبدیلی کے بعد برقرار رہیں۔

بعض حالات میں، حکام نے کسی شخص کو جس کی گرفتاری ہونے والی تھی، خود کو حکام کے حوالے کرنے پر مجبور کرنے کے لیئے، اس کے رشتے داروں کو حراست میں لے لیا۔ غیر سرکاری تنظیموں نے الزام لگایا کہ انٹیلی جنس کے عملے نے اکثر بلوچ قوم پرستوں کے خاندان کے افراد کو پریشان کیا۔ فاٹا میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت اجتماعی سزائیں دی گئیں جن میں رشتے داروں کو یا اسی قبیلے کے لوگوں کے افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔

g۔ داخلی تنازعات میں طاقت کا ضرورت سے زیادہ استعمال اور دوسری خلاف ورزیاں

سال کے دوران، فوج نے شمالی اور جنوبی وزیرستان، صوبہ سرحد کے مالاکنڈ ڈویژن، اور فاٹا کی باجوڑ، مہمند اور خیبر ایجنسیوں سے عسکریت پسندوں کا صفایا کرنے کے لیئے جنگی کارروائیاں کیں۔ ڈان نیوز نے اطلاع دی کہ ملک بھر میں 3,300 سے زیادہ افراد، جن میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے عملے کے لوگ بھی شامل تھے، انسداد دہشت گردی کی سرگرمیوں سے متعلق واقعات میں ہلاک ہو گئے۔ بڑے بڑے واقعات کی اخباری اطلاعات سے یہ بھی پتہ چلا کہ 76 خودکش حملوں میں 1037 افراد کی جانیں گئیں۔ سب سے زیادہ خودکش حملے دسمبر میں ہوئے۔ ان کی تعداد 15 تھی اور ان میں 211 افراد ہلاک ہوئے۔

سیکیورٹی کی خراب حالت، سیکورٹی فورسز اور عسکریت پسندوں کے خوف، اور فاٹا میں باہر کے لوگوں کے آنے جانے پر حکومت اور سیکورٹی فورسز کے کنٹرول کی وجہ سے، انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیئے فوج کی کارروائی کے علاقے میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں اطلاع دینا مشکل ہو گیا۔ کئی ذرائع نے اطلاع دی کہ سیکورٹی فورسز نے زمینی توپ خانے اور ہوائی بمباری کو نشانے کی درستگی کا خیال رکھے بغیر استعمال کیا جس کے نتیجے میں فاٹا میں کثیر تعداد میں سویلین ہلاک وزخمی ہوئے اور املاک کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ عسکریت پسندوں نے جرمانے عائد کیئے اور سرِعام لوگوں کے سر قلم کیئے، لاشوں کی عام نمائش کی، لوگوں کو سنگسار کیا اور کوڑے مارے۔

بلوچستان میں نچلی سطح کی بغاوت جاری رہی۔ غیر سرکاری تنظیموں اور میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق، اس بغاوت کے نتیجے میں جنوری سے نومبر کے آخر تک، کم از کم 800 عسکریت پسند، تقریباً 125 سویلین، اور سیکورٹی فورسز کے 91 ارکان ہلاک ہوئے۔ AHRC کے مطابق، صرف جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہی، 100 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ AHRC کے مطابق، جنوری سے نومبر تک کے عرصے میں، تقریباً 80 ہزار افراد

بے گھر اور 1,300 لاپتہ ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے آخری بار جو سرکاری اعداد و شمار جاری کیئے گئے تھے، ان کے مطابق 2006ء میں ہلاکتوں کی تعداد 158 بیان کی گئی تھی۔

ہلاکتیں

اگست میں کئی نیوز ایجنسیوں نے اطلاع دی کہ مقامی شہریوں نے وادیء سوات میں سڑک کے کنارے مشتبہ طالبان عسکریت پسندوں کی کم از کم 251 لاشیں دیکھیں۔ HRCP نے، بڑی حد تک ہلاک شدگان کے اہلِ خاندان کے انٹرویوز کی بنیاد پر، الزام لگایا کہ بہت سی ہلاکتیں سرکاری سیکورٹی فورسز اور سویلین افراد کی جوابی کارروائی کے نتیجے میں واقع ہوئیں۔ HRCP نے یہ الزام بھی لگایا کہ سیکیورٹی فورسز نے بہت سے عسکریت پسندوں کو جنہیں جنگی کارروائیوں میں حراست میں لیا گیا تھا، ماورائے عدالت ہلاک کر دیا۔

سال کے دوران عسکریت پسندوں نے بہت سے خودکش حملے کیئے۔ 3 مارچ کو، 12 مسلح افراد نے لاہور میں پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر حملہ کیا۔ انھوں نے سیکیورٹی کے عملے کے چھ افراد کو ہلاک اور ٹیم کے آٹھ ارکان کو زخمی کر دیا۔ دو ہفتے بعد، مسلح عسکریت پسندوں نے لاہور میں ایک پولیس ٹریننگ اسکول پر دھاوا بول دیا، اور 18 پولیس افسر ہلاک اور 12 زخمی کر دیے۔ 27 مئی کو، عسکریت پسندوں نے لاہور شہر کے مرکزی کاروباری علاقے میں، سرکاری دفتر کی تین عمارتوں کے سامنے، ایک گاڑی میں لگے ہوئے گھریلو ساخت کے بم کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس واردات میں 26 افراد ہلاک اور 250 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ حکومت نے ان حملوں کا الزام TTP پر لگایا۔

24 اپریل کا دن شروع ہوا تو 24 گھنٹے کے عرصے میں، خودکش بمباری کے تین واقعات ہوئے۔ ایک بمبار نے اسلام آباد کے نزدیک ایک پر ہجوم شیعہ مسجد کے دروازے پر خود کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس واقعے میں کم از کم 26 افراد ہلاک ہوئے۔ اسلام آباد میں ایک اور بمبار نے آٹھ نیم فوجی سیکورٹی افسر ہلاک کر دیے اور ایک تیسرا بمبار اپنی گاڑی شمالی وزیرستان میں میران شاہ میں سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں لے گیا اور اس نے اسکول کے بچوں سمیت، کم از کم آٹھ افراد ہلاک کر دیے۔ حکومت نے ان حملوں کا الزام TTP پر عائد کیا۔ 9 جون کو مسلح دہشت گرد محافظوں سے لڑتے ہوئے پشاور کے Pearl Continental ہوٹل میں داخل ہوئے اور گاڑی میں نصب گھریلو ساخت کا بم دھماکے سے اڑا دیا۔ اس حملے میں دہشت گرد اور 11 دوسرے افراد ہلاک اور 50 سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرنے والے بین الاقوامی امدادی کارکن شامل تھے۔ حکومت نے اس حملے کا الزام TTP پر لگایا۔ 10 اکتوبر کو، چھ مسلح عسکریت پسندوں نے راولپنڈی میں پاکستان آرمی کے جنرل ہیڈ کوارٹرز پر حملہ کیا۔ وہ اس ادارے کے سیکیورٹی کے حلقے میں گھس گئے اور چھ سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ TTP نے اس حملے کی ذمے داری کا دعویٰ کیا۔ 15 اکتوبر کو لاہور میں عسکریت پسندوں نے وفاقی تحقیقاتی ادارے (FIA) کے صوبائی ہیڈ کوارٹرز، مناواں کے پولیس ٹریننگ سکول اور ایلیٹ پولیس کے ہیڈ کوارٹرز پر تقریباً بیک وقت حملے کیے۔ عسکریت پسند ان تینوں اداروں کے سیکیورٹی کے حلقے میں گھس گئے اور 12 پولیس اہل کاروں اور پانچ عام شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ TTP نے اس حملوں کی ذمے داری کا دعویٰ کیا۔ 28 اکتوبر کو، پشاور کی ایک مارکیٹ میں بم کے دھماکے سے، عورتوں اور بچوں سمیت 100 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ نومبر میں عسکریت پسندوں نے باجوڑ کے قبائلی علاقے میں، خار کے نزدیک گھات لگا کر دو خاتون ٹیچرز کو ہلاک کر دیا۔ 8 دسمبر کو، عسکریت پسندوں نے لاہور کی مون مارکٹ میں بموں کے دھماکے کیئے، اور کم از کم 45 افراد کو ہلاک اور 100 سے زیادہ کو زخمی کر دیا۔

فرقوں کے درمیان تنازعات کے باعث بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ ہلاکتیں بھی واقع ہوئیں۔ مثالوں میں یہ واقعات شامل ہیں:

پاکستان

جنوری میں ضلع ہنگو کے گاؤں میں سنّی اور شیعہ گروپوں کے درمیان جھڑپوں میں 17 افراد ہلاک اور 30 زخمی ہوئے۔ 21 فروری کو، ایک خودکش بمبار نے ڈیرہ اسمٰعیل خان میں جنازے کے جلوس کے دوران حملے میں کم از کم 30 افراد کو ہلاک اور 60 کو زخمی کر دیا۔ یہ دھماکہ ایک شیعہ لیڈر کے جنازے کے جلوس کے دوران ہوا جنہیں ایک دن قبل ہلاک کر دیا گیا تھا۔ 8 ستمبر کو، طالبان عسکریت پسندوں نے اسکول کے چار شیعہ بچوں کو گولی مار کر ہلاک اور چھ دوسرے بچوں کو زخمی کر دیا۔ بظاہر یہ فرقہ وارانہ حملہ تھا جو اورکزئی ضلع کے قصبے اتمان خیل میں پیش آیا۔ 12 جون کو، جمعے کی نماز کے بعد، ایک خودکش بمبار ممتاز بریلوی عالم علامہ سرفراز نعیمی کے دارالعلوم کے دفتر میں داخل ہوا اور گھریلو ساخت کا بم دھماکے سے اڑا دیا۔ علامہ نعیمی اور ان کے چار پیروکار اس حملے میں ہلاک ہو گئے۔ علامہ نعیمی نے ملک میں طالبان کی سرگرمیوں کی مذمت کی تھی، خودکش بمباری اور مملکت کے خلاف طالبان کی دھمکیوں کے خلاف فتویٰ جاری کیا تھا، اور صوبہ سرحد کے مالاکنڈ ڈویژن میں دہشت گردوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کی حمایت کی تھی۔ علامہ نعیمی کے پیروکاروں نے دعویٰ کیا کہ یہ حملہ TTP نے کیا تھا۔

2 ستمبر کو، دو نامعلوم مسلح افراد نے مذہبی امور کے وزیر، حامد سعید کاظمی کے کنوائے پر حملہ کیا۔ اس حملے میں کاظمی کے باڈی گارڈ ہلاک ہو گئے اور وزیر کی ٹانگ میں گولی لگی۔ وزیر کاظمی ایک ممتاز بریلوی عالم، اور طالبان کے شدید ناقد ہیں۔ بریلوی لیڈروں نے اس حملے کا الزام طالبان باغیوں پر لگایا۔

سال کے آخر تک قانون نافذ کرنے والے اداروں نے 2007ء میں مولانا حسن جان کے قتل کے سلسلے میں کسی پر الزام عائد نہیں کیا تھا۔ وہ ایک ممتاز اور محترم دیوبندی مذہبی عالم تھے جنھوں نے خودکش حملوں کو غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ پولیس نے 2007ء میں 13 مشتبہ افراد کو گرفتار کیا تھا لیکن اس کے بعد کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

بلوچستان میں سیکیورٹی کی صورتِ حال بدستور غیر مستحکم رہی۔ صوبے کے بہت سے علاقوں میں جن میں ڈیرا بگٹی، کوہلو، نوشکی اور سوئی شامل ہیں، بارودی سرنگوں سے بچوں سمیت سویلین باشندے ہلاک ہوئے۔

2 مارچ کو، بلوچستان کے ضلع پشین میں کلی کربلا کے مقام پر، ایک 15 سالہ لڑکے نے خودکش بم کا حملہ کیا۔ اس حملے میں چھ افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔ جمعیت العلماء اسلام کے صوبائی سربراہ مولانا محمد خان شیرانی، بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر سید مطیع اللہ آغا، اور پارٹی سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزیر جو اسکول کی اس تقریب میں موجود تھے، محفوظ رہے۔

31 جولائی کو بلوچستان ریپبلیکن آرمی نے نصیر آباد ضلع میں چتر کے علاقے سے 18 پولیس والوں، اور 14 مزدوروں کو اغوا کرنے کی ذمہ داری کا دعویٰ کیا۔

2007 میں بلوچ لیڈر نواب خیر بخش مری کے بیٹے میر بالاچ مری کے قتل کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ بات پتہ نہیں چل سکی کہ وہ ملک کے اندر ہلاک ہوئے تھے یا افغانستان میں۔ دسمبر میں وزیرِ اعظم گیلانی نے اعلان کیا کہ ان کی موت کے بارے میں انکوائری کی جائے گی۔

پاکستان

سال کے دوران حریف سیاسی پارٹیوں کے درمیان سیاسی تشدد جاری رہا۔ صرف کراچی میں 256 افراد کو ہدف بنا کر ہلاک کیا گیا۔ ہلاک ہونے والوں میں ایم کیو ایم کے 69 ارکان، ایم کیو ایم – حقیقی کے 60 ارکان، پی پی پی کے 28 ارکان، اور اے این پی اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے 23 افراد شامل تھے۔

اغوا کی وارداتیں

ملک بھر میں مجرموں کے گروہ جن میں سے بعض کے عسکریت پسند گروپوں کے ساتھ روابط تھے، زبردستی پیسہ وصول کرنے اور اغوا کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ جن لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ان میں سفارتکار، غیر ملکی باشندے، مذہبی اقلیتیں، اور غیر سرکاری تنظیموں کے کارکن شامل تھے۔

یکم فروری کو، اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزیں (UNHCR) کے بلوچستان آفس کے سربراہ، John Solecki کو اس وقت اغوا کر لیا گیا جب وہ اپنے آفس جا رہے تھے۔ ان کے ڈرائیور کو ہلاک کر دیا گیا۔ اگلے دِن، بلوچستان لبریشن یونائیٹڈ فرنٹ (BLUF) نے اس اغوا کی ذمہ داری کا دعویٰ کیا۔ 4 اپریل کو BLUF کے عسکریت پسندوں نے 61 دن تک قید میں رکھنے کے بعد، Solecki کو رہا کر دیا۔

8 فروری کو طالبان عسکریت پسندوں نے پولینڈ کے انجنیئر Pioter Stanczak کا سر قلم کرنے کا اعلان کیا، جنہیں انھوں نے پنڈ سلطانی کے علاقے سے 2008ء میں اغوا کیا تھا۔

یکم جون کو، مشتبہ طالبان عسکریت پسندوں نے صوبہ سرحد میں بنوں کے باکاخیل علاقے میں، شمالی وزیرستان ایجنسی میں رزمک کے کیڈٹ کالج کے 120 طالب علموں اور چھ ٹیچرز کو اغوا کر لیا۔ یہ طالب علم اور ان کے ٹیچرز چار گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے اور 28 گاڑیوں کے ایک قافلے کا حصہ تھے جس میں طالب علموں، اساتذہ اور ان کے رشتے داروں سمیت 400 افراد شامل تھے۔ فوج نے بعد میں کچھ طالب علموں کو چھڑا لیا اور باقی کو عسکریت پسندوں نے 4 جولائی کو ایک مقامی جرگے میں مذاکرات کے بعد رہا کر دیا۔

21 اگست کو، حکام نے ایک فرانسیسی سیاح، Anthenio Sarsperla کی رہائی کی تصدیق کی جسے بلوچستان میں دالبندین کے علاقے سے اغوا کیا گیا تھا۔

10 ستمبر کو، نقاب پوش مسلح افراد نے Thanasis Lerounis کو اغوا کیا۔ وہ ایک یونانی رضاکار تھے جو پاکستان کے شمال مغربی حصے میں ایک فلاحی تنظیم کے لیئے کام کر رہے تھے۔ اغوا کرنے والوں نے ان کی رہائی کی شرائط کا اعلان نہیں کیا۔ سال کے آخر تک وہ لاپتہ تھے۔ میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق، اغوا کرنے والوں نے انہیں جنوب مشرقی افغانستان کے نورستان صوبے میں کسی نامعلوم مقام پر قید کر رکھا ہے۔ انہیں قید کرنے والوں نے، تاوان کے طور پر، ایک پاکستانی جیل سے اپنے کئی ساتھیوں کی رہائی، 20 لاکھ ڈالر، اور/یا مذکورہ رضاکار کے مذہب اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

تنازعات سے متعلق دوسری خلاف ورزیاں

پاکستان

فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں مقامی سویلین آبادی کے لیئے اس وقت دشواریاں پیدا ہو گئیں جب عسکریت پسندوں نے آنے جانے کی بڑی بڑی سڑکیں اور سرنگیں بند کر دیں اور مواصلات اور توانائی کے نیٹ ورکس پر حملے کیئے۔ جس سے تجارت، خوراک اور پانی کی تقسیم کے نیٹ ورکس میں خلل پڑا۔ سوات سمیت، بعض علاقوں میں سیکیورٹی فورسز نے کرفیو نافذ کر دیا۔ عسکریت پسندوں نے، خاص طور سے سوات میں، لڑکیوں کے اسکول تباہ کر دیے، اور فاٹا اور صوبہ سرحد میں حجاموں کی دوکانیں، اور مغربی سی ڈیز اور وڈیوز فروخت کرنے والی دوکانیں زبردستی بند کروادیں۔

26 فروری کو، صوبہ سرحد میں مسلح افراد نے ایک منی بس پر جو بچوں کو لے کر اسکول جارہی تھی، گھات لگا کر حملہ کیا۔ انھوں نے ڈرائیور کو ہلاک، دو بچوں کو زخمی، اور چھ دوسرے بچوں کو اغوا کر لیا۔

اخبار ڈان نے نومبر میں اطلاع دی کہ طالبان کی دو سالہ شورش کے دوران، وادیء سوات میں تقریباً 200 اسکول تباہ کر دیے گئے۔ 31 اکتوبر کو، عسکریت پسندوں نے ضلع خیبر میں لڑکیوں کا ایک اسکول بموں سے تباہ کر دیا۔ اسکول کی عمارت تباہ ہو گئی اور پڑوس کے گھروں میں رہنے والے چار افراد زخمی ہو گئے۔ Agence France-Press (AFP) کے مطابق، گاؤں کاری گار میں، دو دھماکوں سے لڑکیوں کا گورنمنٹ ہائی اسکول منہدم ہو گیا۔ AFP کے مطابق، عسکریت پسندوں نے ایک لڑکے کو اغوا کر لیا جس نے بم دھماکے ہوتے دیکھے تھے۔

سیکشن 2 شہری آزادیوں کا احترام، بشمول:

a۔ تقریر اور پریس کی آزادی

قانون میں تقریر اور پریس کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، اور شہری عموماً عوامی مسائل پر بحث کے لیئے آزاد تھے۔ حکومت نے سیاسی سرگرمیوں کی نگرانی اور میڈیا پر کنٹرول کے ذریعے اکثر تنقید میں خلل اندازی کی۔ عسکریت پسندوں اور مجرمانہ عناصر نے صحافیوں اور ان کے گھرانے کے لوگوں کو گرفتار کیا، انہیں مارا پیٹا، اور ڈرایا دھمکایا، جس کے نتیجے میں بہت سوں نے خود اپنے اوپر سینسر شپ عائد کر لی۔

ملک میں بہت سے غیر جانبدار انگریزی اور اردو روزنامے اور ہفتے وار اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی خبر رساں ایجنسی، ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان، جو مقامی میڈیا تک سرکاری اور غیر ملکی خبریں پہنچاتی ہے، وزارتِ اطلاعات (MOI) کے کنٹرول میں اور اسی کے زیرِ انتظام تھی۔ چند چھوٹی چھوٹی نجی ملکیتی خبر رساں ایجنسیاں خود اپنی سینسر شپ کرتی تھیں۔ انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (ISPR) فوج کا اپنا میڈیا ونگ تھا، اور دو سیکشن میڈیا کی نگرانی کرتے تھے۔ فاٹا سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتے تھے۔ اخباروں اور جریدوں کے مالکان کو آزاد کشمیر کے اندر اخبارات شائع کرنے کے لیئے کشمیر کونسل اور وزارت امورِ کشمیر سے اجازت لینا ضروری تھی۔ بہت سے مبصرین کے مطابق، ان اداروں کی طرف سے ایسی مطبوعات کے شائع ہونے کی اجازت ملنے کا امکان نہیں تھا جو کشمیر کے آزاد ہونے کے مقصد کی حمایت کرتی ہوں۔

اگست میں، صوبہ بلوچستان سے سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والے اردو اخبار، روزنامہ آساپ نے اپنی اشاعت معطل کر دی اور کہا کہ سیکیورٹی فورسز کی طرف سے اسے پریشان کیا جارہا ہے۔ بلوچستان کے دو دوسرے اخباروں، ڈیلی بلوچستان ایکسپریس اور ڈیلی آزادی نے بھی سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں پریشان کیئے جانے کی اطلاع دی۔ سال کے آخر تک روزنامہ آساپ بند رہا۔

پاکستان

غیر ملکی رسالے اور اخبار دستیاب تھے، اور بہت سے جریدوں نے ملک کے اندر اپنے نامہ نگار رکھے ہوئے تھے جنہیں اپنا کام کرنے کی آزادی تھی، اگرچہ بعض کو صحافیوں کی حیثیت سے کام کرنے کے لیئے ویزا ملنے میں دشواری ہوئی۔

پاکستان ٹیلیویژن اور پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن، جو پورے ملک میں ریڈیو اسٹیشن میں چلاتی ہے، براہِ راست حکومت کے ملکیت اور کنٹرول میں تھیں۔ یہ دونوں ادارے اپنی خبروں کے کوریج میں سرکاری نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ضابطوں کے قوانین میں پابندیوں کی جو ترامیم سابق صدر مشرف نے 2007 میں نافذ کی تھیں، ان پر اس سال کے دوران عمل درآمد نہیں ہوا۔ پرائیویٹ کیبل اور سیٹلائٹ چینلوں نے ملکی خبریں نشر کیں اور ان میں خود پر سینسر شپ کے باوجود، حکومت پر تنقید شامل تھی۔ نومبر میں، آٹھ ٹیلیویژن چینلوں نے جن میں، سماء ,KTN، ڈان نیوز، دنیا، ایکسپریس نیوز، جیو، اور آج ٹی وی شامل ہیں، دہشت گردی کے حملوں کے کوریج کے لیئے، رضاکارانہ طور پر رہنما اصول تیار کیئے اور ان پر اتفاق کیا۔

جنوری 2008 اور دسمبر کے درمیان، ڈان کے مطابق، MOI نے ملک کے ضابطہء اخلاق کی خلاف ورزی کرنے پر 18 پرائیویٹ ٹیلیویژن چینلوں کے نام 64 قانونی نوٹس جاری کیئے۔ MOI نے 18 قانونی نوٹس Independent Media Corporation کے نام جاری کیئے جو پرائیویٹ ٹیلیویژن چینل جیو ٹی وی کی مالک ہے۔ یہ نوٹس دیے جانے کی وجوہات میں دہشت گردی کے حملوں کو کَور کرنا اور ایسا وڈیو نشر کرنا شامل ہے جس میں طالبان کو یرغمالوں کو رہا کرتے دکھایا گیا تھا۔

12 مارچ کو ملک کے بعض حصوں میں کیبل آپریٹرز نے جیو نیوز کی نشریات بند کر دیں۔ Independent Media Corporation نے دعویٰ کیا کہ آپریٹرز نے یہ اقدام وفاقی حکومت کی ہدایت پر کیا تاکہ 14 مارچ کو وکلاء کا جو لانگ مارچ ہونے والا تھا اس کی میڈیا کوریج کو محدود کیا جا سکے۔ اطلاعات کے مطابق جیو کی نشریات کو بلاک کرنے پر احتجاج کے طور پر، اس وقت کی وزیرِ اطلاعات شیری رحمٰن نے استعفیٰ دے دیا۔ کیبل آپریٹرز نے جیو چینل کے سگنل کو چند گھنٹوں کے اندر بحال کر دیا۔

10 اکتوبر کو، ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق، حکومت نے جیو ٹی وی نیوز، ARY نیوز، اور سماء سمیت تین ٹی وی چینلوں کو کئی گھنٹے کے لیئے بلاک کر دیا، اور ایکسپریس نیوز کو مختصر عرصے کے لیئے بلاک کیا۔ یہ اقدام راولپنڈی میں فوج کے ہیڈ کوارٹرز پر طالبان کے حملے کے بعد کیا گیا۔ ISPR کے ڈائرکٹر جنرل اور وزیرِ اطلاعات و نشریات نے بعد میں اس بات سے انکار کیا کہ انھوں نے ان اسٹیشنوں کو بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ کئی ذرائع نے جن میں ان میں سے دو چینلوں کے نمائندے شامل ہیں، یہ قیاس لگایا کہ حکومت نے ان اسٹیشنوں کو فوج کے ہیڈ کوارٹرز پر حملے کے واقعے کو نشر کرنے کی سزا دی تھی۔

بڑے بڑے شہروں میں پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن موجود تھے، لیکن ان کے لائسنس کے تحت انہیں خبروں کے پروگرام نشر کرنے کی ممانعت تھی۔ بعض چینلوں نے اس پابندی سے بچنے کا طریقہ یہ نکالا کہ اپنے ٹاک شوز میں خبروں پر بات چیت شامل کر لی، اگرچہ انھوں نے یہ احتیاط کی کہ بیشتر داخلی امور پر بحث سے پرہیز کیا۔ بی بی سی، اور وائس آف امریکہ سمیت، ریڈیو کی بین الاقوامی نشریات دستیاب تھیں۔

پاکستان

پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی آرڈیننس کا اطلاق فاٹا پر یا صوبہ سرحد کے PATA پر نہیں ہوتا تھا۔ فاٹا میں غیر جانبدار ریڈیو اسٹیشنوں کو فاٹا کی سکریٹریٹ کی اجازت سے ریڈیو پروگرام نشر کرنے کی اجازت ہے۔ فاٹا میں عسکریت پسند اور مذہبی شخصیتیں تقریباً 150 غیر قانونی اسٹیشن چلا رہی تھیں۔

سال کے دوران سیکورٹی فورسز، سیاسی پارٹیوں، عسکریت پسندوں، اور نامعلوم گروپوں نے میڈیا کی تنظیموں، صحافیوں، اور صحافیوں کے اہلِ خانہ پر حملے کیئے اور ڈرانے دھمکانے کا نشانہ بنایا۔ صحافیوں کو اغوا بھی کیا گیا۔ اخبارات نے اکثر حکومت، سیاسی لیڈروں، اور فوجی کاروائیوں پر تنقید کی۔ میڈیا کی ایسی تنظیموں کے خلاف جنھوں نے خود اپنے آپ پر سینسر شپ عائد نہیں کی، بعض اوقات انتقامی کارروائی کی گئی۔

اپریل میں صوبہ سرحد میں عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران، طالبان نے اخبارات اور ٹیلیویژن چینلوں کو خبردار کیا کہ وہ ان کے بارے میں منفی خبریں شائع یا نشر نہ کریں۔ 28 اپریل کو جاری کیئے جانے والے ایک پوسٹر میں طالبان نے میڈیا کو انتباہ کیا کہ اگر انھوں نے مالاکنڈ ڈویژن میں "شریعت پر عمل درآمد کے لیئے" طالبان کی جدوجہد کے خلاف پراپیگنڈہ بند نہ کیا، تو انہیں ہولناک نتائج بھگتنے ہوں گے۔ اس پوسٹر کی کاپیاں اخبارات اور پرائیویٹ ٹیلیویژن چینلوں کے دفاتر کے باہر چسپاں کر دی گئی تھیں۔ 22 دسمبر کو ایک خودکش بمبار نے پشاور پریس کلب پر حملہ کیا، اور چار افراد کو ہلاک اور 17 کو زخمی کر دیا۔ مقامی صحافیوں نے کہا کہ پریس کلب کو طالبان کی جانب سے بہت سی دھمکیاں مِل چکی تھیں۔

اگست میں چھپنے والی Intenational Freedom of Expression Exchange رپورٹ کے مطابق، پاکستان میں 2008 سے اب تک 11 صحافی ہلاک کیئے جا چکے ہیں؛ the World Association of Newspapers and New Publishers نے اطلاع دی ہے کہ سال کے دوران آٹھ صحافی ہلاک ہوئے۔ مندرجہ ذیل کیسوں سے صحافیوں پر کیئے جانے والے حملوں کی عکاسی ہوتی ہے:

4 جنوری کو، ایک خودکش بمبار نے صوبہ سرحد کے شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں گورنمنٹ پولی ٹیکنک کالج کے سامنے، ایکسپریس ٹی وی کے زیرِ تربیت کیمرہ مین محمد عمران کو، اور مقامی روزناموں، اعتدال اور اپنا اخبار کے فری لانس رپورٹر سلیم طاہر اعوان کو ہلاک کر دیا۔

24 جنوری کو 48 گھنٹے کے اندر، صحافی وکیل احمد کی ہلاکت اور نجی ملکیت والے ایک ٹیلیویژن اسٹیشن پر حملے کے بعد، Reporters without Borders نے حکام پر زور دیا کہ وہ صحافیوں کی حفاظت کے لیئے اقدامات کریں۔

18 فروری کو، نامعلوم مسلح افراد نے سوات میں جیو ٹی وی کے ایک رپورٹر، موسیٰ خان خیل کو ہلاک کر دیا۔ وہ اس وقت طالبان کے حامی ایک مذہبی شخصیت کے امن مشن کو کوَر کر رہے تھے۔ ان کے گلے کو بھی جزوی طور پر کاٹ دیا گیا۔

24 اگست کو، افغانستان کی سرحد کے قریب درّۂ خیبر کے علاقے میں، مسلح افراد نے گھات لگا کر حملہ کیا اور ایک افغان صحافی، اور ٹیلیویژن چینل شمشاد کے پشاور بیورو کے چیف، جان اللہ ہاشم زادہ کو ہلاک، اور ان کے ساتھی علی خان کو شدید زخمی کر دیا۔ ہلاک ہونے والے دوسرے صحافیوں میں آج ٹی وی کے صدیق باچا خان جو 14 اگست کو ہلاک ہوئے، بلوچستان ایکسپریس کے وصی احمد جو 16 اپریل کو ہلاک ہوئے، اور The Nation اور وقت ٹی وی کے راجا اسد حمید شامل ہیں جو 26 مارچ کو ہلاک ہوئے۔

پاکستان

نومبر 2008 میں پشاور میں دو صحافیوں کو گولی مارے جانے کے واقعے میں، جن میں ایک جاپانی شہری تھا، مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ دونوں نزدیکی خیبر ایجنسی میں ایک طالبان کمانڈر کو انٹرویو کرنے کے بعد واپس آئے تھے۔ 2007 میں سندھی زبان کے اخبار، روزنامہ نجات کے ایڈیٹر، مخدوم ہاشمی کے قتل کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ہاشمی مقامی جاگیرداروں اور زمینداروں کی پالیسیوں پر تنقید کرتے رہتے تھے، اور انھوں نے اس بات پر بھی تنقید کی تھی کہ حکام نے ان کی تحفظ فراہم کرنے کی درخواستوں کو مسترد کر دیا تھا۔

2007 کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں دو نامعلوم افراد نے ساؤتھ ایشیا نیوز ایجنسی کے ایڈیٹر ان چیف، شکیل احمد ترابی پر حملہ کیا اور انہیں مارا پیٹا، کیوں کہ وہ اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے متعلق بحران کی رپورٹنگ کر رہے تھے۔

2007 کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں آج ٹیلی وژن اسٹیشن اور کراچی میں اس کی املاک پر حملہ ہوا کیوں کہ اسٹیشن نے رتشدد پُ مظاہروں کی براہ راست رپورٹنگ کی تھی۔

2007 کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں عسکریت پسندوں نے روزنامہ مشرق کے نامہ نگار نصر اللہ آفریدی کے گھر کو ہینڈ گرینیڈز کا نشانہ بنایا تھا کیوں کہ انھوں نے خیبر ایجنسی میں عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کی تھی۔

Anti-Terrorism Act کے تحت کوئی ایسا مواد اپنے پاس رکھنے یا تقسیم کرنے کی ممانعت ہے جس کا مقصد فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینا ہو یا کوئی ایسا مواد جو کالعدم تنظیموں سے حاصل کیا گیا ہو۔ غیر ملکی کتابوں کو دوبارہ چھاپنے سے پہلے سرکاری سینسر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے، لیکن عملی طور پر، اس سال کے دوران کسی کتاب پر پابندی لگنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ کتابیں اور رسالے آزادی سے درآمد کیئے جا سکتے ہیں لیکن ان میں قابلِ اعتراض جنسی یا مذہبی مواد کے لیئے ان کا سینسر ہونا ضروری ہے۔

فحش لٹریچر قابلِ ضبطی ہے اور یہ ایسی کیٹیگری ہے جسے حکومت بہت وسیع معنی دیتی ہے۔ ٹیلیویژن اور ریڈیو اسٹیشن ایسے موضوعات پر ڈرامے اور دستاویزی پروگرام نشر کرتے ہیں جو پہلے ممنوع تھے۔ ان میں کرپشن، سماجی مراعات، منشیات، عورتوں کے خلاف تشدد، اور عورتوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک شامل ہیں۔

انٹرنیٹ کی آزادی

اگرچہ ایسی کوئی اطلاعات نہیں ملی ہیں کہ حکومت نے انٹرنیٹ تک عام لوگوں کی رسائی کو محدود کرنے کی کوشش کی ہو، اس نے ملک میں قائم بعض انتہا پسندانہ اور بلوچ ویب سائٹس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین نے اندازہ لگایا ہے کہ جون تک، ملک میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ 85 لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی، اور ملک کے تمام شہری اور نیم شہری علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت دستیاب تھی۔

مقامی ذرائع نے اطلاع دی کہ حکام نے Walochwarna پر پابندی جاری رکھی۔ یہ ایک ویب سائٹ ہے جو بلوچستان کی آزادی کا پرچار کرتی ہے۔ 10 ستمبر تک، ویب سائٹ Walochwarna، جو بلوچستان کی آزادی کی حامی ویب سائٹ ہے جس پر پہلے پابندی لگا دی گئی تھی، انٹرنیٹ پر دستیاب تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ یہ کسی مداخلت کے بغیر کام کر رہی ہے۔

پاکستان

نومبر 2008 میں صدر زرداری نے Prevention of Electronic Crimes Ordinance جاری کیا، جس میں صراحت کی گئی ہے کہ سائبر پر دہشت گردی کی سزا، جس کے نتیجے میں کوئی موت واقع ہوئی ہو، سزائے موت یا عمر قید ہو گی۔

علم و دانش کی آزادی اور ثقافتی پروگرام

حکومت نے عام طور سے تعلیم کی آزادی کو محدود نہیں کیا لیکن تشدد اور رواداری کے فقدان کا جو ماحول طالب علموں کی تنظیموں نے قائم کر دیا تھا، اس سے تعلیمی آزادی محدود رہی۔ عام طور سے یہ تنظیمیں سیاسی پارٹیوں سے وابستہ تھیں۔ کراچی میں بعض یونیورسٹی کیمپسوں میں، طالب علموں کے مسلح گروپوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں اور وہ دوسرے طالب علموں، اساتذہ، اور انتظامیہ کے افراد کو ڈراتے دھمکاتے رہے۔ ان میں سے بیشتر گروپ آل پاکستان متحدہ اسٹوڈنٹس آرگنائیزیشن (ایم کیو ایم سے وابستہ)، اور اسلامی جمعیتِ طلبا (جماعتِ اسلامی سے وابستہ) سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کے درمیان اختلاف زبان، سلیبس کے مواد، امتحانوں کی پالیسیوں، گریڈز، نظریات، اور لباس جیسے امور پر تھا۔

یہ گروپ اکثر عملے کی ملازمتوں، یونیورسٹیوں میں داخلوں، اور بعض اوقات ادارے کے فنڈز کے استعمال پر اثر انداز ہوئے۔ انہیں عام طور سے یہ اثر ورسوخ احتجاجی جلسوں، کیمپس میڈیا پر کنٹرول، اور وسیع پیمانے پر تشدد کی دھمکیوں کے مجموعی استعمال سے حاصل ہوا۔ جوابی کارروائی کے طور پر، یونیورسٹی کے حکام نے بہت سے کیمپسوں پر سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے دیا، لیکن اس اقدام کا اثر محدود رہا۔

سینٹرل فلم سینسر بورڈ نے وزارتِ ثقافت کے تحت کام کیا۔ یہ بورڈ تمام غیر ملکی اور ملکی فلموں کی جانچ کرتا ہے، اس سے پہلے کہ یہ ملک میں دکھائی جائیں۔ عملی طور پر سال کے دوران کسی بھی فلم کی نمائش کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ آرٹ کی نمائشوں یا موسیقی یا دوسری ثقافتی سرگرمیوں پر حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی گئی۔

b۔ پُرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی

قانون میں اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی دی گئی ہے، لیکن یہ آزادی ان پابندیوں سے مشروط ہے جو قانون کے تحت عائد ہیں۔

اجتماع کی آزادی

اگرچہ آئین میں اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن عملی طور پر حکومت نے بعض مخصوص حالات میں اجتماع کے حق پر پابندیاں عائد کر دیں۔ قانون کے تحت، ضلعی حکام پولیس کی اجازت کے بغیر، چار سے زیادہ افراد کے اجتماع پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ انفرادی حیثیت سے، احمدیوں پر 1984ء سے کانفرنسوں یا اجتماعات کے انعقاد پر پابندی لگی ہوئی ہے۔

مارچ کے شروع میں حکومت نے اس مظاہرے کو روکنے کی کوشش کی جس کا منصوبہ "لانگ مارچ" کے عنوان سے بنایا گیا تھا، حکومت نے بہت سے وکیلوں اور سیاست دانوں کو گرفتار کر لیا۔ حکومت نے پورے ملک میں مظاہروں اور عوامی اجتماعات پر بھی پابندی لگا دی اور اسلام آباد جانے والی تمام سڑکیں بند کر دیں۔ 12 مارچ کو احتجاجی مظاہرین کی بڑی تعداد نے کوئٹہ اور کراچی سے روانہ ہونے والے مارچ اس وقت ختم کر دیے جب پولیس نے ان شہروں سے پنجاب جانے والی تمام سڑکوں تک ان کی رسائی مسدود کر دی۔ 15 مارچ کو جب لاہور میں احتجاجی مظاہرین حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، صبح اور دوپہر سے قبل جمع ہوئے، تو پولیس نے ان پر آنسو گیس کے گولے پھینکے اور ڈنڈے

برسائے۔ اس طرح کئی سو افراد زخمی ہو گئے۔ لاہور میں سہ پہر کے وقت، پاکستان مسلم لیگ۔ نواز کے لیڈر نواز شریف نے گھر میں اپنی نظر بندی کے احکام کی خلاف ورزی کرکے اپنے گھر سے نکل کر مظاہرے کے مقام پر احتجاج کرنے والوں میں شریک ہونے کے لیئے روانہ ہو گئے۔ حکومت نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش ترک کر دی اور احتجاجی مظاہرین کو کسی رکاوٹ کے بغیر، اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے کی اجازت دے دی۔ 16 مارچ کی صبح کو، حکومت نے احتجاج کرنے والوں کے یہ مطالبات تسلیم کر لیئے کہ افتخار چودھری کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر بحال کر دیا جائے، اور احتجاج کرنے والوں نے اپنا مارچ ختم کر دیا۔ پولیس نے لانگ مارچ کے دوران مظاہرین، سول سوسائٹی کے ارکان، سیاسی کارکنوں، اور وکیلوں کو مارچ میں شرکت سے روکنے کے لیئے انہیں امتناعی حراست میں لیا اور ضرورت سے زیادہ طاقت استعمال کی۔

انجمن سازی کی آزادی

آئین میں ان پابندیوں کے ساتھ جن کی صراحت قانون میں کی گئی ہے، انجمن سازی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کے لیئے حکومت کے پاس رجسٹریشن کرانا ضروری ہے۔ سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم کی وفاقی وزارت کے مطابق، ملک میں 100,000 سے زیادہ غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی تھیں؛ چونکہ قانونی اور انضباطی ڈھانچہ مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے، اس لیئے غیر سرکاری تنظیموں کی صحیح تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ سال کے دوران کسی ممتاز غیر سرکاری تنظیم نے رجسٹریشن کے معاملے میں حکومت کے ساتھ مسائل کی اطلاع نہیں دی۔ بعض تنظیمیں رجسٹریشن کے بغیر کام کرتی رہیں اور ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔

غیر سرکاری تنظیمیں اس رضاکارانہ ضابطۂ اخلاق (code of conduct) پر احتجاج کرتی رہیں جو وزارتِ سماجی بہبود و خصوصی تعلیم نے 2007 میں نافذ کیا تھا۔ اس کوڈ کے تحت حکومت کو غیر سرکاری تنظیم کی سرگرمیوں میں باقاعدگی پیدا کرنے، تنظیم کے عملے یا انتظامیہ کو تبدیل کرنے، اور ایسی تنظیموں کے اثاثے منجمد کرنے کا اختیار حاصل ہے جو حکومت کی ہدایات پر عمل نہ کریں۔ عملی طور پر، اس کوڈ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا ہے، اور اس سے غیر سرکاری تنظیموں کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی ہے۔

فاٹا اور صوبہ سرحد میں عدم استحکام کی وجہ سے، اور عورتوں کے حقوق کے فروغ کے لیئے کام کرنے والی تنظیموں کو درپیش خطرات کی وجہ سے، غیر سرکاری تنظیموں کے کارکنوں کی سلامتی مسئلہ بنی رہی۔ سال کے آخر تک غیر سرکاری تنظیموں کے سات کارکن ہلاک کیئے جا چکے تھے، سات کا اغوا کیا گیا تھا لیکن بعد میں انہیں رہا کر دیا گیا، اور بہت سوں کو دھمکیاں ملی تھیں۔ اپریل میں پولیس کو ضلع مانسہرہ میں شنکیاری کے علاقے میں چار مقامی امدادی کارکنوں کو گولیوں سے چھلنی لاشیں ملیں۔ ان میں تین عورتیں اور ایک مرد تھا۔ پولیس کے ایک مقامی عہدے دار نے AFP کو بتایا کہ یہ لاشیں کنڈ کے جنگل سے ملی تھیں۔ ستمبر میں اخبارات میں بعض ایسی رپورٹیں شائع ہوئیں جن میں بعض خفیہ سرکاری دستاویزات شامل تھیں۔ ان رپورٹوں میں اُن دشواریوں کی تفصیل درج تھی جو بعض بیرونی غیر سرکاری تنظیموں کو اپنے عملے کے لیئے ویزے حاصل کرنے میں پیش آئی تھیں۔ کاغذات سے ظاہر ہوا کہ سیکیورٹی ایجنسیوں نے بعض بیرونی غیر سرکاری تنظیموں کے عملے کے لیئے ویزے کے اجرا کو روک دیا تھا کیوں کہ انہیں ملک میں ان کی سرگرمیوں، اور ایک بیرونی حکومت کے ساتھ اس کے روابط کے بارے میں تشویش تھی۔

c۔ مذہب کی آزادی

پاکستان

آئین میں کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کو آزادی سے اپنے مذہب کا اعلان کرنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کے لیئے کافی اقدامات کیئے جائیں گے، لیکن عملی طور پر حکومت نے مذہبی آزادی کو محدود کر دیا۔ اسلام مملکت کا سرکاری مذہب ہے، اور آئین کے تحت ضروری ہے کہ تمام قوانین اسلام سے مطابقت رکھتے ہوں۔ وفاقی شرعی عدالت اس امر کو یقینی بناتی ہے کہ قوانین شریعت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تمام شہریوں پر توہینِ مذہب کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ آئین کے تحت آزادیٔ تقریر " قانونی طور پر لگائی ہوئی ان معقول پابندیوں سے مشروط ہے جو اسلام کی عظمت کی خاطر لگائی گئی ہوں۔"

HRCP کے مطابق، سال کے دوران، اقلیتوں کے خلاف تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ ان لوگوں کے خلاف جن کے بارے میں مذہبِ اسلام ترک کرنے کا شبہ تھا، انتقامی کارروائی کی گئی اور انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ مذہبی اقلیتوں کے ارکان پر تشدد ہوا اور انہیں پریشان کیا گیا، اور بعض اوقات پولیس نے ایسے افعال کو روکنے، یا ان کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف فردِ جرم عائد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں بلا خوف و خطر اس قسم کی کارروائیاں کرنے کا ماحول پیدا ہوا۔ آئین میں صراحت کی گئی ہے کہ صدر اور وزیرِ اعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ وزیرِ اعظم، وفاقی وزراء، اور وزرائے مملکت، نیز سینیٹ اور قومی اسمبلی کے منتخب ارکان کے لیئے (غیر مسلم ارکان سمیت)، " اسلامی نظریے کی حفاظت کی جدو جہد کرنے" کا حلف لینا ضروری ہے، جو ملک کی تخلیق کی بنیاد ہے۔

مذہبی گروپوں کے لیئے منظوری حاصل کرنا اور رجسٹریشن کرانا لازمی ہے۔ ایسی کوئی رپورٹس نہیں ملیں کہ حکومت نے کسی گروپ کو رجسٹر کرنے سے انکار کیا ہو۔

قانون میں احمدی کمیونٹی کو، جو خود کو مسلمانوں کا فرقہ سمجھتی ہے، غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے۔ قانون کے تحت، احمدیوں کو جن کی تعداد 20 لاکھ سے زیادہ ہے، مسلمانوں کے کسی بھی طور طریقوں کو استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ اس میں مسلمانوں کا سلام کا طریقہ، اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہنا، اسلامی دعائیں پڑھنا، مخصوص اسلامی اصطلاحات استعمال کرنا، اور حج یا رمضان کے روزوں میں شرکت کرنا بھی شامل ہے۔ احمدیوں کو کسی کا مذہب تبدیل کرانے، اجتماعات منعقد کرنے، یا لٹریچر تقسیم کرنے کی ممانعت ہے۔ حکومت کے فارموں میں، جن میں پاسپورٹ کی درخواست کے فارم اور ووٹروں کی رجسٹریشن کے فارم شامل ہیں، خود کو مسلمان کی حیثیت سے درج کرانے والے ہر شخص کے لیئے ضروری ہے کہ وہ احمدیہ مذہب کے بانی کی مذمت کرے۔ احمدیہ فارن مشن کے مطابق، اس سال کے دوران 11 احمدیوں کو ان کے مذہب کی بنا پر ہلاک کیا گیا؛ احمدیوں کو ہدف بنا کر ان کے خلاف نو حملے کیئے گئے، جن کے نتیجے میں کئی لوگ شدید زخمی ہوئے؛ 37 احمدیوں پر توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت الزامات عائد کیئے گئے؛ اور 57 احمدیوں پر احمدیوں کے لیئے مخصوص قوانین کے تحت فردِ جرم عائد کی گئی۔ سال کے آخر تک کوئی احمدی قرآن کی بے حرمتی کے الزامات کی بنا پر جیل میں نہیں تھا۔

فوجداری قانون کے تحت پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ کی توہین کرنے والے شخص کو موت یا عمر قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ قانون میں قرآن کی بے حرمتی کی سزا عمر قید ہے، اور کسی دوسرے شخص کے مذہبی عقائد کی اہانت کرنے پر، اگر نیت یہ ہو کہ مذہبی احساسات مجروح کیئے جائیں، دس سال قید تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ موخر الذکر سزا صرف ان لوگوں کے خلاف استعمال کی گئی جنھوں نے مبینہ طور پر محمد ﷺ کی توہین کی تھی۔ 22 جنوری کو پولیس نے ہیکٹر علیم کو گرفتار کر لیا۔ وہ عیسائیوں کے انسانی حقوق کی ایک غیر سرکاری تنظیم کے ڈائریکٹر ہیں۔ ایک عسکریت پسند اسلامی تنظیم کے ایک رکن نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے اپنے سیل فون سے توہین مذہب کا ایک ٹیکسٹ میسیج بھیجا ہے۔ اگرچہ جب شہادت سے پتہ چلا کہ ٹیکسٹ

میسیج علیم کے فون سے نہیں بھیجا گیا تھا، تو توہین مذہب کا الزام واپس لے لیا گیا، لیکن توہین مذہب کی ترغیب دلانے کا الزام باقی رہا۔ ایک جج نے 30 اپریل کو ان کی ضمانت نامنظور کر دی اور انہیں "خود ان کے اپنے تحفظ کی خاطر" قانونی تحویل میں دے دیا گیا۔ CLAAS کے مطابق، ایسا اس وقت کیا گیا جب ایک مذہبی انتہا پسند وکیل نے عدالت کی سماعت کے دوران انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ سال کے آخر تک، علیم جیل میں تھے اور توہینِ مذہب کی شہ دینے کے الزامات میں مقدمہ چلنے کے منتظر تھے۔

28 جنوری کو حکام نے ایک بالغ فرد اور چار نوجوان لڑکوں سمیت پانچ احمدیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے صوبہ پنجاب میں ایک مسجد کے غسل خانے کی دیوار پر محمد ﷺ کا نام لکھا تھا۔ AHRC کے مطابق ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ یہ پانچ افراد اس حرکت کے ذمہ دار تھے، اور حکام نے ان کی گرفتاری سے قبل کوئی تفتیش نہیں کی۔ ان چاروں طالب علموں کا، جنھوں نے مبینہ طور پر اس بالغ فرد کے کہنے پر غسل خانوں کی دیواروں کو خراب کیا تھا، مسجد سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ وہ مسجد کے نزدیک رہتے تھے۔ پولیس کے ایک عہدے دار نے کہا کہ پولیس کو کسی ایسے ٹھوس ثبوت کا علم نہیں تھا جس سے طالب علموں کے ساتھ اس جرم کا تعلق نظر آتا ہو۔ AHRC کے مطابق، ضلعی پولیس افسر نے ملزمان کے اہلِ خانہ کو بتایا کہ پولیس پر مذہبی بنیاد پرستوں کی طرف سے طالب علموں کے خلاف کارروائی کرنے کے لیئے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ طالب علموں کو جولائی میں رہا کر دیا گیا۔

جون 2008ء کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں پولیس نے پنجاب میں ربوہ کے تمام مکینوں پر احمدیوں کے خلاف قوانین کے تحت الزامات عائد کیئے گئے تھے اور محمد یونس کو آتشبازی چھوڑنے اور چراغ جلانے، اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ حکومت کی نظر میں یہ سب اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیئے کیا گیا تھا جو قانون کے تحت جرم ہے۔

پولیس نے اگست 2008ء میں احمدیوں کے تمام مراکز بند کر دیے جب ایک شہری نے یہ شکایت کی کہ احمدی کوشش کر رہے ہیں کہ لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر احمدی ہو جائیں۔ ان مراکز کو اس شرط پر دوبارہ کھولنے کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مراکز پر سے کلمہ ہٹا دیں (کلمۂ شہادت جس کے ذریعے اسلام کا اقرار کیا جاتا ہے)۔

14 دسمبر کو ایک مقامی عدالت نے ایک عیسائی گل شیر مسیح اور اس کی بیٹی صندل گل شیر کو بری اور رہا کر دیا۔ انہیں اکتوبر 2008ء میں فیصل آباد سے اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب لڑکی کے باپ پر قرآن کی بے حرمتی کا الزام لگایا گیا۔

2007ء کے اس کیس میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی جس میں انٹیلی جنس بیورو کے ایک ضلعی افسر نے دو نابالغوں سمیت پانچ احمدیوں کی گرفتاری کا حکم دیا تھا، جب ایک ٹیچر نے نابالغوں کے پاس احمدی فرقے کے بچوں کا ایک رسالہ دیکھا۔ جب میڈیا میں اس کیس کی بہت زیادہ تشہیر ہوئی، تو الزامات واپس لے لیئے گئے، لیکن فروری 2007ء میں دو بالغ افراد کے خلاف دوبارہ درج کرا دیے گئے۔

سال کے آخر تک، اس ریٹائرڈ سب انسپکٹر کے 2007ء کے کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی، جس نے پنجاب کے علاقے منڈی بہاؤالدین کے نزدیک سیراہ کے مقام پر، ایک ریستوران میں حال ہی میں احمدی مذہب اختیار کرنے والے ایک شخص کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ سال کے آخر تک وہ جیل میں تھا اور کیس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

پاکستان

ایک عیسائی عورت، مارتھا بی بی کو، جسے 2007ء میں توہینِ مذہب کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، ضمانت پر رہا کر دیا گیا؛ سال کے آخر تک اس کا کیس مقامی عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔

توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت شکایتوں کا استعمال کاروبار یا ذاتی جھگڑوں میں اپنے دشمنوں کو پریشان کرنے کے لیئے کیا گیا۔ ان قوانین کے تحت بیشتر شکایتیں اکثریتی سنّی مسلمانوں کے خلاف دوسرے سنّیوں کی طرف سے درج کرائی گئیں۔ اپیل کی عدالتوں نے توہینِ مذہب کے بیشتر کیسوں کو خارج کر دیا۔ تاہم ملزمان عدالت کا فیصلہ ہونے تک برسوں جیل میں رہے۔ ٹرائل کورٹس توہینِ مذہب کے ملزموں کو ضمانت پر چھوڑنے یا رہا کرنے سے گریزاں تھیں کیوں کہ انہیں یہ خطرہ تھا کہ انتہا پسند مذہبی گروپ تشدد پر اتر آئیں گے۔ 2005ء میں اس قانون پر عمل درآمد شروع ہوا جس میں شکایات درج کرانے کے طریقہ کار پر نظرِ ثانی کے لیے کہا گیا تھا اور جس میں سینیئر پولیس افسروں کے لیئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ایسے کیسوں کا جائزہ لیں تاکہ جعلی الزامات کو ختم کیا جا سکے۔ انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کے لیئے کام کرنے والے گروپوں کے مطابق، یہ طریقہ موئثر ثابت نہیں ہوا کیوں کہ پولیس کے اعلیٰ افسروں کے پاس ایسے کیسوں کا جائزہ لینے کے لیئے وسائل دستیاب نہیں تھے۔ عیسائیوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں پر کوئی قانونی پابندی نہیں تھی۔ ضلعی ناظمین کو نئے چرچ یا مندر کی ضرورت کا اندازہ لگانے کے بعد، تعمیر کی اجازت دینی ہوتی تھی۔ مذہبی اقلیتی گروپوں کو دفتری کارروائیوں میں تاخیر اور رشوت کے مطالبات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ عام رکاوٹیں تھیں جو تمام مذہبی گروپوں کو اس وقت پیش آتی تھیں جب وہ عبادت گاہیں تعمیر کرنے یا زمین حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

سرکاری اسکولوں میں اسلامیات (مطالعۂ اسلام) تمام مسلمان طالب علموں کے لیئے لازمی مضمون تھا۔ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے طالب علم ان کلاسوں سے مستثنیٰ تھے۔ عملی طور پر، اساتذہ نے غیر مسلم طالب علموں کو مجبور کیا کہ وہ اسلامی علوم کا مضمون مکمل کریں۔

معاشرے میں حقوق کی خلاف ورزیاں اور امتیازی سلوک

سال کے دوران سنّی اور شیعہ انتہا پسندوں کے درمیان تشدد جاری رہا۔ شیعہ، عیسائی، اور احمدی ملک بھر میں مذہبی تشدد کا نشانہ بنتے رہے۔

اپریل میں عسکریت پسندوں نے سکھ آبادی پر حملے شروع کر دیے۔ یہ حملے خاص طور سے فاٹا میں زیریں اورک زئی کے علاقوں قاسم خیل اور فیروز خیل میں کیئے گئے۔ مثلاً 13 اپریل کو، عسکریت پسندوں نے ایک مقامی سکھ لیڈر کلیان سنگھ کو اغوا کر لیا، اور کمیونٹی کو مجبور کیا کہ وہ پانچ کروڑ روپے ($595,000) جزیے کے طور پر ادا کرے۔ یہ زرِ تاوان بعد میں کم کر کے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے ($178,500) کر دیا گیا۔ سکھ کمیونٹی نے تنگ آ کر اورک زئی میں اپنے گھر بار چھوڑ دیے۔

فاٹا اور مالاکنڈ میں فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں، سینکڑوں سکھ گھرانوں نے متاثرہ علاقے چھوڑ کر پاکستان کے دوسرے حصوں میں پناہ لی۔ حکومت نے داخلی طور پر بے گھر ہونے والے سکھوں کو امداد فراہم کی اور سال کے آخر تک، مالاکنڈ سے تعلق رکھنے والے بیشتر سکھ اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔

31 جولائی اور یکم اگست کو، ان الزامات کے بعد کہ عیسائی برادری کے کچھ ارکان نے توہینِ مذہب کا ارتکاب کیا ہے، ہجوموں نے پنجاب کے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں گوجرہ اور کوریاں کی بستیوں پر حملہ کیا۔ ہجوموں نے ان بستیوں میں بیشتر املاک کو نقصان پہنچایا۔ آٹھ عیسائی جو اپنے گھروں میں پھنس کر رہ گئے تھے، جل کر ہلاک ہو گئے۔ انسانی حقوق کے گروپوں نے دعویٰ کیا کہ ضلعی انتظامیہ اور پولیس نے ان ہجوموں کو روکنے کے لیئے

پاکستان

ضروری اقدامات نہیں کیئے۔ صوبائی حکومت نے اس واقعے کی تفتیش کے لیئے لاہور ہائی کورٹ کا ایک انکوائری ٹریبونل قائم کیا۔ ٹریبونل نے اپنا کام 6 ستمبر کو مکمل کر لیا اور دسمبر میں اپنی رپورٹ پیش کر دی جس میں مستقبل میں اس قسم کے تشدد کے خلاف حکومت کو انتباہ کیا گیا تھا، اور مجرموں کے خلاف بلاامتیاز کارروائی کی سفارش کی گئی تھی۔ پولیس نے اس فساد کے سلسلے میں 102 افراد کو گرفتار کیا اور ان پر الزامات عائد کیئے۔ ان میں اشتعال دینے والے چار مبینہ افراد شامل تھے جن کا تعلق کالعدم سپاہِ صحابہ انتہا پسند گروپ سے تھا۔ لاہور ہائی کورٹ نے ملزمان میں سے پانچ کی ضمانت کی درخواست منظور کر لی۔

پاکستان کرسچین پوسٹ کے مطابق، 28 اگست کو عسکریت پسندوں نے کوئٹہ، بلوچستان میں، چھ عیسائیوں کو گولی مار کر ہلاک اور سات کو زخمی کر دیا۔ یہ واقعہ اس روز پیش آیا جس روز بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت کی برسی منائی جا رہی تھی۔ وہ بگٹی قبیلے کے لیڈر تھے اور انہیں پاکستانی فوج نے 2006ء میں ہلاک کیا تھا۔

حکومت نے 2008ء میں پنجاب میں ایک چرچ، ایک ہندو مندر، اور پانچ احمدی مسجدوں پر حملوں کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔

1984ء کے Anti-Ahmadiyya Ordinance کے نفاذ کے بعد سے اب تک، 295 احمدیوں پر توہینِ مذہب کے قوانین کے تحت الزامات عائد کیئے گئے ہیں، اور دو احمدی اب بھی جیل میں قید ہیں۔

The National Commission for Justice and Peace نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے اغوا اور جبری تبدیلیٔ مذہب کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کمیشن نے دسمبر میں اطلاع دی کہ سال کے دوران 20 عیسائیوں اور 21 ہندوؤں کو جبراً مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں سے 15 مرد، 13 عورتیں، اور چار بچے تھے۔

حکام نے یہ دلیل دی کہ قانون کے تحت نابالغ لڑکیوں کو ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد غیر مسلم گھرانوں میں واپس نہیں بھیجا جا سکتا، چاہے ان نابالغ لڑکیوں کو اغوا ہی کیا گیا ہو اور اس کے بعد ہی انہیں مسلمان کیا گیا ہو۔ اگرچہ گھرانوں نے الزام لگایا کہ نابالغ لڑکیوں کا قبولِ اسلام اور اس سلسلے میں حکام نے تصدیق کے لیئے جو حلف نامے پیش کیئے تھے وہ سب دھوکہ دہی پر مبنی تھے، پھر بھی حکام نے ان نابالغ لڑکیوں کو انھیں اغوا کرنے والوں سے رہا کرانے کے بعد، ان کے گھرانوں کو واپس نہیں کیا۔

ہندو کمیونٹی کو سیکیورٹی فورسز کی طرف سے پریشان کرنے اور رشوت کے مطالبوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اپریل میں ایک اقلیتی وزیر نے سندھ اسمبلی میں دعویٰ کیا کہ 18 ہندو عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ مذہبی اقلیتوں کے 30 سے 35 افراد کو اغوا کیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک موت واقع ہوئی ہے۔

احمدی لیڈروں نے الزام لگایا کہ عسکریت پسند سنّی ملاؤں اور ان کے پیروکاروں نے بعض اوقات ربوہ کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ ربوہ میں احمدیوں کی بھاری اکثریت ہے اور وسطی پنجاب کا یہ شہر ان کا روحانی مرکز ہے۔ احمدیوں نے دعویٰ کیا کہ ان مارچوں کے دوران عام طور سے پولیس موجود ہوتی تھی۔

احمدی، عیسائی، ہندو، اور شیعہ مسلمان کمیونٹیوں نے اطلاع دی کہ ان کے ساتھ ملازمتوں اور سرکاری اداروں سمیت تعلیم تک رسائی میں بہت زیادہ امتیازی سلوک کیا گیا۔ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت اسکولوں میں اسلامیات کی تعلیم لازمی ہے؛ غیر مسلم طالب علموں کو اس کورس کے بدلے عام اخلاقیات کا کورس لینے کی اجازت تھی۔ کئی مذہبی اقلیتی گروپوں نے دعویٰ کیا اس پالیسی سے غیر مسلم طالب علموں کی مذہبی آزادی پر ضرب پڑتی ہے اور کیونکہ درسی کتب میں سے دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے متعلق معلومات کو حذف کر دیا گیا ہے، اس لیئے ان کتابوں میں اسلام کے حق میں زیادہ مواد شامل ہو گیا ہے۔

اگرچہ ملک میں یہودی شہریوں کی تعداد برائے نام تھی، لیکن یہودیوں کے خلاف جذبات بظاہر بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے تھے۔

زیادہ مفصل بحث کے لیئے، www.state.gov/g/drl/rls/irf/ پر 2009 International Religious Freedom Report دیکھیئے۔

d۔ نقل و حرکت کی آزادی، داخلی طور سے بے گھر افراد، پناہ گزینوں کی حفاظت، اور ایسے افراد جن کا کوئی وطن نہیں ہے۔

قانون میں ملک کے اندر نقل و حرکت کی آزادی، غیر ملکی سفر، نقلِ مکانی، اور ملک میں واپسی کی اجازت دی گئی ہے۔ عملی طور پر حکومت نے ان حقوق کو محدود کر دیا تھا۔ حکومت نے یہ شرط عائد کر دی کہ غیر ملکی افراد سیکیورٹی کی وجوہات کی بنا پر فاٹا، بلوچستان، اور صوبہ سرحد کے بعض حصوں سمیت، پابندی والے علاقوں میں داخل ہونے کے لیئے خصوصی پرمٹ حاصل کریں۔ غیر ملکیوں کے آزاد کشمیر میں داخل ہونے کے لیئے ضروری تھا کہ وہ حکومت سے No Objection Certificate (NOC) حاصل کریں۔

قانون کے تحت اسرائیل کا سفر کرنا ممنوع ہے لیکن عملی طور پر اس قانون پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ سرکاری ملازمین اور طالب علموں کو بیرونی ملکوں کا سفر کرنے سے پہلے NOC حاصل کرنا ضروری تھا، اگرچہ طالب علموں کے خلاف اس شرط کا اطلاق شاذ و نادر ہی کیا گیا۔

ایگزٹ کنٹرول لسٹ (ECL) میں شامل افراد کو غیر ملکی سفر کی ممانعت تھی۔ اگرچہ ECL کا مقصد ایسے لوگوں کو باہر جانے سے روکنا تھا جن کے خلاف فوجداری مقدمات زیرِ سماعت ہوں، وزارتِ داخلہ کو ECL میں کسی نام کے اضافے کے لیئے کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض اوقات ECL کو انسانی حقوق کے کارکنوں اور قوم پرست پارٹیوں کے لیڈروں کو پریشان کرنے کے لیئے استعمال کیا گیا۔ جن لوگوں کے نام فہرست میں شامل تھے انہیں اپنے نام نکلوانے کے لیئے عدالت میں اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

قانون کی تحت جبری ملک بدری کی ممانعت ہے اور اس سال کے دوران کسی جبری ملک بدری کی اطلاع نہیں ملی۔

اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد (IDPs)

اس سال کے دوران صوبہ سرحد اور فاٹا میں عسکریت پسندوں کی کارروائیوں اور فوجی آپریشنز کی وجہ سے، IDPs کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ آبادی کی بے دخلی کی ابتدا اگست 2008ء میں فاٹا اور صوبہ سرحد کے ضلع دیر میں، باجوڑ اور مہمند ایجنسیوں سے شروع ہوئی۔ اپریل کے آخر اور مئی کے شروع میں جب عسکریت پسندوں کی کارروائیاں بونیر تک پہنچ گئیں تو ان کے خلاف فوجی آپریشن شروع ہونے کے بعد، صوبہ سرحد کے لوئر دیر، بونیر، اور سوات کے ضلعوں سے زیادہ بڑی تعداد میں لوگوں نے اپنے گھر بار چھوڑ دیے۔ گھروں سے بے دخل ہونے والوں (IDPs) کی کُل تعداد

بڑھ کر 28 لاکھ 70 ہزار تک پہنچ گئی۔ حکومت اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد دینے والی بین الاقوامی کمیونٹی نے تمام IDPs کے تحفظ، اور انہیں غذا، شیلٹر، دواؤں، پانی اور صفائی ستھرائی کے انتظامات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیئے مِل جُل کر کام کیا۔ حکومت نے مالاکنڈ ڈویژن کے تقریباً تین لاکھ 20 ہزار بے گھر خاندانوں کو ان کی واپسی میں سہولت کے لیئے 25 ہزار روپے (300$) مالیت کے ڈیبٹ کارڈز بھی فراہم کیئے۔ اس کے علاوہ، حکومت نے جنوبی وزیرستان کے بے گھر ہونے والے لگ بھگ 21 ہزار بے گھر خاندانوں کو پانچ ہزار روپے (60$) مالیت کے ڈیبٹ کارڈز گھریلو اخراجات میں مدد کے لیئے فراہم کیئے۔ اس بارے میں تشویش پائی گئی کہ حکومت نے امداد کی اہلیت کا تعین کرنے کے لیئے بعض علاقے مخصوص کر دیے تھے، یا جن لوگوں کے قومی شناختی کارڈز کے سلسلے میں مسائل موجود تھے انہیں امداد کا نااہل قرار دے دیا۔ صوبہ سرحد کے حکام کے 16 جولائی کے اعلان کے مطابق، صرف ایسے لوگوں کو بے گھر افراد (IDPs) قرار دیا جاسکتا تھا جن کی بے دخلی فوج کے کسی موجودہ یا عنقریب ہونے والے آپریشن کا نتیجہ تھی۔ نومبر کے آخر تک، جب کافی لوگ اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے، IDP کی تعداد تقریباً بارہ لاکھ تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو حال ہی میں، باجوڑ، خیبر، کرّم، اور کزئی، اور جنوبی وزیرستان ایجنسیوں سے بے دخل ہوئے تھے۔ 12 لاکھ بے گھر افراد میں سے زیادہ تر میزبان کمیونٹیوں میں یا فاٹا اور صوبہ سرحد میں کرائے کی رہائش گاہوں میں رہ رہے تھے اور تقریبا ایک لاکھ 25 ہزار بے گھر افراد صوبہ سرحد کی خیمہ بستیوں میں مقیم تھے۔

2003ء سے جاری ہونے والی میڈیا رپورٹوں کے اندازے کے مطابق بھارت کی زیرِ کنٹرول کشمیر سے بے دخل ہونے والے 15 لاکھ کشمیری ملک میں داخل ہو چکے تھے۔ قانون کے تحت کشمیریوں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسرے مکمل شہریوں کے ہیں۔

پناہ گزینوں کی حفاظت

پاکستان پناہ گزینوں کی حیثیت کے بارے میں 1951ء کے کنونشن، اور اس کے 1967ء کے پروٹوکول میں فریق نہیں ہے، لیکن عملی طور پر حکومت نے بیشتر کیسوں میں پناہ گزینوں کے اخراج یا ایسے ملکوں میں ان کی واپسی کے خلاف تحفظ فراہم کیا جہاں ان کی زندگیوں یا آزادی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ پاکستان اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزیں (UNHCR) کی انتظامی ایگزیکیو کمیٹی کا رکن ہے اور اس نے افغان پناہ گزینوں کو حفاظت، ان کی مدد اور واپسی میں UNHCR سے تعاون کیا۔

1979 سے اب تک حکومت نے افغانستان سے آنے والے لاکھوں پناہ گزینوں کو عارضی تحفظ فراہم کیا ہے۔ سرکاری انتظام میں چلنے والی National Database and Registration Authority کے مطابق، ملک میں رجسٹرڈ افغان پناہ گزینوں کی تعداد تقریباً 17 لاکھ ہے۔ ایسے کوئی قابلِ اعتبار اندازے دستیاب نہیں ہیں جن سے پتہ چل سکے کہ ملک میں کاغذی کارروائی کے بغیر یا غیر رجسٹرڈ افغان پناہ گزینوں کی تعداد کتنی ہے۔ حکومت پناہ گزینوں کی اس آبادی کو امداد کی فراہمی کے لیئے UNHCR کے قریبی تعاون سے کام کرتی رہی، اگرچہ UNHCR، اور پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں کے درمیان وہ سہ فریقی سمجھوتہ جس میں وہ شرائط اور حالات بیان کیئے گئے ہیں جن کے تحت افغان پناہ گزیں پاکستان میں رہ سکتے ہیں، اور UNHCR کی مدد سے ان کی رضاکارانہ واپسی کا طریقہ کار بیان کیا گیا ہے، 31 دسمبر کو ختم ہو گیا۔ اگرچہ وزیرِاعظم نے 31 دسمبر تک Afghan Management Strategy پر دستخط نہیں کیئے، لیکن ریاستی امور اور سرحدی علاقہ جات کی وزارت (Ministry for States and Frontier Regions (SAFRON)) نے UNHCR کے نام ایک بیان جاری کیا کہ پاکستان، افغان پناہ گزینوں کو ان کے پروف آف رجسٹریشن کارڈز (PoR) کی مدت ختم ہونے کے بعد، انہیں افغانستان جانے کے لیئے مجبور نہیں کرے گا۔ SAFRON نے یہ درخواست بھی کی کہ

پاکستان

وفاقی وزارتِ داخلہ، صوبوں کے داخلی امور کے محکموں اور دوسرے حکام کو ہدایات جاری کرے تاکہ PoR کارڈز رکھنے والوں کو پریشان نہ کیا جائے ۔اس دوران پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے لیئے Management and Repatriation Strategy برائے 2010-12 کو آخری شکل دی جارہی تھی۔ UNHCR کے مطابق، ملک میں افغان پناہ گزیں کیمپوں کی تعداد 80 سے زیادہ تھی۔ان میں صوبہ سرحد میں 71، بلوچستان میں 12، اور پنجاب میں ایک کیمپ شامل تھا۔ بیشتر افغان پناہ گزیں شہری علاقوں میں رہتے تھے۔

اگست 2008ء میں شروع ہونے والی فوجی کاروائیوں کے نتیجے میں باجوڑ میں ہونے والی اندرونی بے دخلی کے علاوہ، 20000 سے زیادہ افراد 2008ء میں فرار ہو کر ہمسایہ صوبے کنڑ میں پہنچ گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سال کے دوران سیکیورٹی بہتر ہونے پر ان کی اکثریت واپس آ گئی ہے ۔

اکتوبر 2008ء میں، حکومت نے باجوڑ میں رہنے والے افغان پناہ گزینوں کو حکم دیا کہ وہ افغانستان واپس چلے جائیں۔ حکومت نے ان پناہ گزینوں کو ملک بدر کرنا شروع کر دیا جو رضاکارانہ طور پر واپس نہیں گئے اور جو پاکستان واپس آ گئے انہیں گرفتار کرلیا۔ سیکیورٹی فورسز نے اطلاع دی کہ اکتوبر سے، سینکڑوں عسکریت پسند تشدد کی کارروائیاں کرنے کے لیئے، وقفے وقفے سے افغانستان سے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔

بعض اوقات پولیس نے افغان پناہ گزینوں سے رشوت طلب کی۔اس قسم کی قابلِ اعتبار رپورٹیں ملیں کہ انٹیلی جنس سروسز نے پناہ گزینوں کو پریشان وہراساں کیا۔ بعض خواتین پناہ گزینوں نے جنھوں نے غیر سرکاری تنظیموں میں ملازمت اختیار کرلی تھی، اطلاع دی کہ ان کی کمیونٹی میں طالبان سے ہمدردی رکھنے والے لوگ انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔ پناہ گزینوں کو مقامی آبادی کی طرف سے معاشرتی طور پر امتیازی سلوک اور برے برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی آبادی کو پناہ گزینوں کی طرف سے اقتصادی مسابقت ناگوار تھی، اور جرائم کی شرح میں اضافے اور دہشت گردی کے لیئے پناہ گزینوں کو موردِ الزام ٹھیرایا گیا۔

اگرچہ پناہ گزینوں کو عدالتوں تک رسائی میسر نہیں تھی، حکومت نے خاص طور سے افغان پناہ گزینوں کو صحت کی بنیادی سہولتیں اور تعلیمی خدمات فراہم کیں۔ ہر افغان پناہ گزیں کو جس نے خود کو UNHCR اور سرکاری انتظام میں چلنے والے Commissionerate for Afghan Refugees، دونوں میں رجسٹر کرالیا تھا، ضروری کاغذی کارروائی کے بعد سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ دے دیا گیا۔ اکیلی عورتوں، ایسے گھرانے جن کی سربراہ عورتیں تھیں، اور سڑکوں پر کام کرنے والے بچوں کے لیئے خاص طور سے بدسلوکی اور انسانوں کی تجارت کا شکار ہونے کا خطرہ زیادہ تھا۔

ملک میں پناہ گزینوں کے معاملات کے انتظام وانصرام اور نقلِ مکانی سے متعلق قانونی اور انتظامی ڈھانچے کا فقدان ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن میں یہ طے کرنا مقامی حکومت یا انفرادی صوابدید پر منحصر ہے کہ پناہ گزینوں کے حقوق کیا ہیں اور انہیں کون سی سہولتوں اور خدمات تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً، اسٹیٹ بنک کے گورنر نے طے کیا کہ افغان باشندے بنک اکاؤنٹ کھولنے کے مجاز نہیں ہیں، لیکن National Database and Registration Authority بنکوں کے لیئے ان پناہ گزینوں کی شناخت کی تصدیق کرتی رہی جو بنک اکاؤنٹ کھولنے کے خواہشمند تھے۔ اگرچہ ایسا کوئی مخصوص قانون نہیں ہے جس کے تحت افغان باشندوں کو ڈرائیورز لائسنس حاصل کرنے کی اجازت ہو، صوبہ سرحد میں ٹرکوں کی ایک بڑی تعداد کے ڈرائیور افغان تھے۔ افغان باشندے املاک کے مالک تھے یا انھوں نے املاک لیز پر لی ہوئی تھیں، لیکن کبھی کبھی کسی شہری یا صوبائی حکومت نے ہدایات جاری کیں کہ افغان باشندوں کی تمام لیزیں منسوخ کر دی جائیں۔ افغان باشندے سرکاری

ملازمتیں حاصل نہیں کر سکتے تھے، لیکن انہیں اکثر صنعتوں میں ملازمت مِل جاتی تھی اگرچہ کبھی کبھی مقامی سطح پر حکم جاری ہوتا تھا کہ تمام افغان کارکنوں کو برطرف کر دیا جائے۔ اگرچہ بہت سے افغان اسکول غیر ملکی امداد سے چلتے ہیں، عام طور سے افغان بچوں کو پاکستانی پرائمری اسکولوں میں جانے میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا تھا۔ بڑی عمر کے طالب علموں کے لیئے، اور خاص طور سے شہروں میں، اسکولوں تک رسائی زیادہ مشکل تھی۔ ان افغانوں کے لیئے بھی جو پاکستان میں پلے بڑھے ہیں، پاکستان میں یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیئے عام طور سے اسٹوڈنٹ ویزا درکار ہوتا تھا، لیکن پناہ گزیں، PoR کارڈ کی بنیاد پر، اسٹوڈنٹ ویزا حاصل کر سکتے تھے۔ افغان پناہ گزیں اپنے لیئے پولیس اور عدالتوں کی خدمات حاصل کر سکتے تھے، لیکن کچھ لوگ، خاص طور سے غریب لوگ ایسا کرنے سے ڈرتے تھے۔ بعض کیسوں میں، خاص طور سے جب کوئی جرم انتہائی نفرت انگیز ہو، UNHCR نے جرائم کا شکار ہونے والے پناہ گزینوں کے لیئے قانونی چارہ جوئی کی ہے۔

سیکشن 3 سیاسی حقوق کا احترام: شہریوں کا یہ حق کہ وہ اپنی حکومت تبدیل کر سکیں

قانون میں شہریوں کی اکثریت کو اپنی حکومت کے تبدیل کرنے کا حق دیا گیا ہے، اور ملک میں 2008ء کے قومی اور صوبائی انتخابات کے نتیجے میں حزبِ اختلاف کی پارٹیاں برسرِ اقتدار آئیں۔ گلگت۔ بلتستان، فاٹا، اور آزاد جموں اور کشمیر میں اپنے اپنے منفرد نظام رائج تھے۔ صدر نے پارلیمنٹ کو برطرف کرنے کا اختیار اپنے پاس باقی رکھا۔ یہ وہ اختیار ہے جو اس وقت کے صدر مشرف نے صدارت کے عہدے کو منتقل کر دیا تھا اور پھر 2002ء میں اسے آئین کی دفعہ 58(2)b میں قانون کی شکل دے دی تھی۔

گلگت۔ بلتستان کے رہنے والوں کی قومی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ 7 ستمبر کو، صدر زرداری نے Gilgit-Baltistan Empowerment and Self-Governance Order پر دستخط کیئے۔ اس حکم کے تحت، ان علاقوں کو جو پہلے شمالی علاقہ جات کہلاتے تھے، بہت سے صوبوں جیسے اختیارات دے دیے گئے اور انہیں گلگت۔ بلتستان کا نام دے دیا گیا۔ 24 ارکان پر مشتمل گلگت۔ بلتستان کی قانون ساز اسمبلی کے پہلے انتخابات نومبر میں ہوئے جن میں PPP کو ووٹوں کی اکثریت حاصل ہوئی۔ 11 دسمبر کو، اسمبلی نے PPP کے سید مہدی شاہ کو گلگت۔ بلتستان کا پہلا وزیرِ اعلیٰ منتخب کیا اور اس طرح وفاقی حکومت کی براہِ راست حکومت ختم ہو گئی۔ اس علاقے میں ایک سپریم اپیلیٹ کورٹ ہے جس کے سربراہ چیف جج ہیں، پبلک سروس کمیشن ہے، چیف الیکشن کمشنر ہیں اور ایک آڈیٹر جنرل ہیں۔

قومی اسمبلی میں فاٹا میں رہنے والے لوگوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ تھی، لیکن قبائلی علاقوں کے بارے میں وفاقی حکومت کی طرف سے کیئے جانے فیصلوں میں ان کی کوئی آواز نہیں تھی۔ یہ اختیار صدر کے پاس ہے۔ قبائلی علاقوں کے باشندوں کو اپنی مقامی حکومت کو تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا، جب کہ غیر منتخب سول بیوروکریٹس برائے نام قبائلی ایجنسیوں کو چلاتے تھے۔ فاٹا میں 2007ء میں منتخب کونسلیں قائم کی گئی تھیں جن کا مقصد قبائلی علاقوں میں مقامی نمائندگی فراہم کرنا تھا۔ ان منتخب کونسلوں کو قبائلی علاقوں کے انتظام میں کوئی سرگرم کردار نہیں دیا گیا ہے۔ فاٹا پر Political Parties Act کا اطلاق نہیں ہوتا، اور وہاں کوئی سیاسی پارٹی قانونی طور پر کوئی مہم نہیں چلا سکتی اور نہ کوئی آفس قائم کر سکتی ہے۔ 13 اگست کو، صدر زرداری نے اعلان کیا کہ ان کا ارادہ ہے کہ اس ایکٹ کو فاٹا تک وسعت دے دی جائے۔ سال کے آخر تک انھوں نے ضروری احکامات پر دستخط نہیں کیئے تھے۔ بعض سیاسی پارٹیوں نے دعویٰ کیا کہ سیاسی پارٹیوں کی سرگرمیوں پر یہ پابندی بے معنی ہے کیوں مذہب کی بنیاد پر قائم پارٹیاں، جیسے جمعیت علمائے اسلام اور JI نے، قانون کے باوجود، وہاں کھلم کھلا انتخابی مہم چلائی۔

پاکستان

آزاد جموں اور کشمیر پر اس کے اپنے آئین کا اطلاق ہوتا ہے جس کے تحت وہاں ایک قانون ساز اسمبلی اور ایک وزیرِ اعظم ہے لیکن 2006 کی HRW کی رپورٹ کے مطابق، پارٹیوں اور امیدواروں کو انتخابات میں حصہ لینے کی ممانعت ہے اگر وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حمایت نہ کریں۔ HRW کی رپورٹ کے مطابق، آزاد جموں اور کشمیر میں منتخب پارلیمنٹ اور ایگزیکیو کی موجودگی کے باوجود، اس علاقے میں اہم فیصلوں پر وفاقی حکومت کا کنٹرول رہا۔ آزاد جموں اور کشمیر کے آئین کے مطابق، پالیسی کے 52 اہم شعبوں میں اختیارات اسلام آباد میں آزاد جموں اور کشمیر کونسل کو تفویض کر دیے گئے ہیں، جس کی عددی ترتیب اس طرح ہے کہ وفاقی حکومت کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ وفاقی حکومت کوئی وجہ بتائے بغیر، آزاد جموں اور کشمیر کی منتخب قانون ساز اسمبلی کو برطرف کر سکتی ہے۔

انتخابات اور سیاسی عمل میں عوام کی شرکت

12 نومبر کو، گلگت۔ بلتستان میں قانون ساز اسمبلی کا پہلا انتخاب ہوا۔ PPP کو اکثریت حاصل ہوئی۔ سِول سوسائٹی کی تنظیموں کے نیٹ ورک، Free and Fair Election Network (FAFEN) کے مطابق، سرکاری مداخلت، کمزور انتظامات، قواعد و ضوابط کی بے قاعدگیوں، اور ووٹرز کی فہرست میں غلطیوں کی وجہ سے انتخاب کے نتائج متاثر ہوئے۔ HRCP کے مبصرین کے مشن نے اطلاع دی کہ ناکافی تیاریوں کے وجہ سے جو نقائص پیدا ہوئے، ان سے انتخابات کی ساکھ مجروح ہوئی۔ اگرچہ یہ انتخاب نسبتاً پُرامن تھا، پھر بھی تشدد کے کئی واقعات میں دو افراد ہلاک اور کم از کم 40 زخمی ہوئے۔

فروری 2008ء میں قومی پارلیمانی انتخابات ہوئے جن کے نتیجے میں وزیرِ اعظم یوسف گیلانی کی قیادت میں، سابق حزبِ اختلاف کی پارٹیوں نے PPP کی سربراہی میں مخلوط حکومت قائم کی۔ یہ انتخابات کئی بار ملتوی کیئے گئے۔ آخری بار ان کا التوا 2007ء میں PPP کی لیڈر بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے ہوا۔ ستمبر 2008ء کے بالواسطہ صدارتی انتخاب میں، بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری، پرویز مشرف کی جگہ صدر منتخب ہوگئے۔ پرویز مشرف نے اگست 2008ء میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ PPP اور مخلوط حکومت میں اس کے شراکت داروں نے قومی حکومت کی انتظامیہ اور مقنّنہ کی شاخوں اور چار میں سے تین صوبائی اسمبلیوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ پاکستان مسلم لیگ –نواز (PML-N) نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا کنٹرول سنبھالا۔ PML-N جو ابتدا میں قومی حکومت میں PPP کی سب سے بڑی پارٹنر تھی، مخلوط حکومت سے 25 اگست، 2008ء کو الگ ہو گئی۔ بظاہر اس کی وجہ PML-N کا یہ اصرار تھا کہ 2007ء کے ہنگامی حالت کے دوران جن ججوں کو برطرف کیا گیا تھا، انہیں ان کے پرانے عہدوں پر بحال کیا جائے۔

بین الاقوامی اور ملکی مبصرین نے دیکھا کہ فروری 2008ء کا انتخاب مقابلے کی فضا میں ہوا اور طریقہ کار میں شدید نقائص کے باوجود، نتائج سے ایسا لگتا ہے کہ ووٹروں کی خواہش کی عکاسی ہوئی۔ حکومت نے تمام موجودہ سیاسی پارٹیوں کو انتخاب لڑنے کی اجازت دی۔ تمام بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں نے شرکت کی۔ بائیکاٹ کرنے والی پارٹیوں میں پاکستان تحریکِ انصاف، بعض بلوچ پارٹیاں، اور متحدہ مجلس عمل کے اتحاد کی کئی پارٹیاں شامل تھیں۔

حکومت نے یہ لازمی قرار دیا کہ جب لوگ ووٹ کے لیئے رجسٹریشن کرائیں تو اپنا مذہب بتائیں۔ یورپی یونین کے الیکشن آبزرویشن مشن کے مطابق، احمدی کمیونٹی نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا کیوں کہ ان کے لیئے ووٹروں کی علیحدہ فہرست میں رجسٹریشن کرانا ضروری قرار دیا گیا تھا۔

پاکستان

FAFEN نے انتخاب سے پہلے پورے ملک میں سیکورٹی سروسز اور مقامی زمینداروں کی طرف سے ووٹروں اور سیاسی پارٹیوں کو خوفزدہ کرنے کے واقعات کے دستاویزی ثبوت جمع کیئے۔ خاص طور سے، ان کے مبصرین نے یہ بات نوٹ کی کہ پولیس نے امیدواروں اور سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کو ان کے خلاف کیس رجسٹر کرنے کی دھمکیاں دے کر ان پر دباؤ ڈالا۔ مبینہ طور پر پولیس نے اکثر حزبِ اختلاف کی پارٹیوں کے جلسوں کی اجازت نہیں دی اور بعض افراد پر PML کو ووٹ دینے کے لیئے دباؤ ڈالا۔ FAFEN نے ایسے کیسوں کے دستاویزی ثبوت جمع کیئے جن میں انٹیلی جنس سروسز نے امیدواروں پر اپنے نام واپس لینے کے لیئے دباؤ ڈالا۔

اطلاعات کے مطابق الیکشن کمیشن آف پاکستان (ECP) نے تقریباً 25,000 ملکی مبصرین کو انتخابات کا مشاہدہ کرنے کی اجازت دی تھی۔ ان کی اکثریت کا تعلق FAFEN سے تھا۔ یورپی یونین اور ڈیموکریسی انٹر نیشنل ان تنظیموں میں شامل تھیں جو مبصرین کی بین الاقوامی ٹیمیں لائی تھیں۔ ستمبر 2008ء میں پہلی بار، ECP نے انتخابات کے تصدیق شدہ نتائج اس طرح جاری کیئے کہ پولنگ اسٹیشنوں کے نتائج الگ الگ دکھائے گئے تھے۔ یہ انتخاب کے عمل کو زیادہ شفاف بنانے کی طرف ایک قدم تھا۔

انتخابات کے ضابطۂ اخلاق میں سیاسی جلسوں پر جو پابندیاں پہلے سے موجود تھیں، بے نظیر بھٹو اور دوسرے ممتاز لیڈروں پر خودکش حملوں کے بعد، وزارتِ داخلہ نے ان سے زیادہ پابندیاں عائد کر دیں۔

International Foundation for Electoral Systems نے یہ بات نوٹ کی جن متنازع انتخابی نتائج کو چیلنج کیا گیا، ان کی سماعت اور عدالتی فیصلے کا طریقۂ کار کمزور تھا، اور ہائی کورٹوں کے سامنے جو کیس لائے گئے، ان کا فیصلہ اس ڈیڈ لائن کے دوران نہیں کیا گیا جو قانون میں درج ہے۔

قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لیئے PML-N کے لیڈر نواز شریف اور پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیئے شہباز شریف کی اہلیت کو چیلنج کرنے کے لیئے لاہور ہائی کورٹ کے الیکشن ٹریبونل کے سامنے الگ الگ درخواستیں پیش کی گئیں۔ سپریم کورٹ نے سال کے دوران دونوں درخواستوں کو خارج کر دیا۔

342 نشستوں کی قومی اسمبلی میں 60 نشستیں عورتوں کے لیئے مخصوص تھیں، اور مزید 16 نشستیں خواتین نے براہِ راست انتخاب جیت کر حاصل کیں۔ وفاق کابینہ میں پانچ خواتین شامل تھیں۔ 2008ء میں ملک کی تاریخ میں پہلی بار، ایک خاتون اسپیکر، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کا انتخاب ہوا۔ صوبائی اسمبلیوں کی 758 نشستوں میں سے، 128 عورتوں کے لیئے مخصوص تھیں۔ لوکل کونسلوں میں خواتین کے لیے ایک تہائی نشستیں مختص تھیں۔ صوبائی وزرائے اعلیٰ نے اپنی اپنی کابینہ میں کام کرنے کے لیئے خواتین کو نامزد کیا۔ بعض اضلاع میں، سماجی اور مذہبی قدامت پسندوں نے عورتوں کو امیدوار بننے سے روک دیا۔

قومی اسمبلی کی مخصوص نشستوں میں سے دس مذہبی اقلیتوں کے لیئے مختص تھیں، اور ان میں سے ایک رکن اقلیتوں امور کے وفاقی وزیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ یہ نشستیں سیاسی پارٹیوں میں اس تناسب سے تقسیم کی گئیں تھیں جس تناسب سے انھوں نے اسمبلی میں نشستیں جیتی تھیں۔ قانون کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کی 23 مخصوص نشستیں رکھی گئی تھیں: پنجاب میں آٹھ، سندھ میں نو، صوبہ سرحد میں تین، اور بلوچستان میں تین۔

پاکستان

سیکشن 4 سرکاری عہدے داروں میں کرپشن اور حکومت کی شفافیت

قانون کے تحت سرکاری عہدے داروں کی کرپشن کے لیئے سزائیں مقرر کی گئی ہیں؛ حکومت نے عملی طور پر اس قانون پر موئثر طریقے سے عمل در آمد نہیں کیا، اور سرکاری عہدے دار اکثر دیدہ دلیری سے کرپشن میں ملوث رہے۔ عوام میں بڑے پیمانے پر کرپشن کا تاثر موجود تھا۔

خصوصی احتساب عدالتوں میں NAB کے ذریعے دائر کیئے گئے کیسوں کے مقدمے چلائے جاتے ہیں۔ ان میں مالدار لوگوں کی طرف سے سرکاری قرضوں کی عدم ادائیگی کے مقدمے بھی شامل ہیں۔ جو کاروبار واقعی ناکام ہوگئے ان کے خلاف اور چھوٹے موٹے نادہندہ افراد اور اداروں کے خلاف، NAB نے کارروائی نہیں کی۔ احتساب عدالتوں سے توقع کی جاتی تھی کہ مقدمے تیس دِن کے اندر چلائے جائیں گے۔ احتساب کے کیسوں میں مفروضہ یہ ہوتا تھا کہ جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

عالمی بنک کے Worldwide Governance Indicators کے مطابق، ملک میں کرپشن سنگین مسئلہ تھا۔

16 دسمبر کو سپریم کورٹ نے NRO کو کالعدم قرار دے دیا، اور اس قانون سے جن لوگوں کو فائدہ پہنچا تھا، ان سب کے خلاف کیس دوبارہ کھول دیے۔ سال کے آخر تک، اس قانون سے مستفید ہونے والے تمام افراد کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ ان میں صدر سمیت وزراء اور پارلیمینٹ کے ارکان سبھی شامل تھے۔

اپریل 2008ء میں NAB کے جرائم کے انسداد اور اقتصادی شعبوں کی FIA کو واپسی کے بعد، جو وزارتِ داخلہ کے سامنے جوابدہ ہے، NAB کی طرف سے حزبِ اختلاف کے سیاستدانوں پر مقدمے چلانے کے لیئے انہیں خاص طور پر نشانہ بنانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس وقت کے صدر مشرف نے 2002ء میں ان شعبوں کو FIA سے NAB کو منتقل کر دیا تھا۔ NAB نے فوج میں ڈیوٹی دینے والے افراد پر یا ججوں کے خلاف مقدمے نہیں چلائے۔

فریڈم آف انفارمیشن آرڈی نینس کے تحت ان معلومات کو محدود کر دیا گیا جن تک شہری رسائی حاصل کر سکتے ہوں۔

سیکشن 5 انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کے بارے میں بین الاقوامی اور غیر سرکاری تنظیموں کی تفتیش پر حکومت کا رویہ

چند مستثنیات کو چھوڑ کر، بہت سی اقسام کے انسانی حقوق کے ملکی اور بین الاقوامی گروپوں نے حکومت کی طرف سے پابندیوں کے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔ انھوں نے انسانی حقوق کے کیسوں کی تفتیش کی اور ان کے نتائج کو شائع کیا۔ نئی انتظامیہ کے سرکاری عہدے داروں نے تعاون کیا، لیکن گروپوں کے خیالات سے صرف کسی حد تک ہی اتفاق کیا۔

حکومت نے غیر سرکاری تنظیموں سے ٹیکنکل تعاون کی درخواست کی۔ اس قسم کی درخواستیں خاص طور سے بین الاقوامی NGOs سے کی گئیں اور ان سے امدادی کارروائیوں، اقتصادی ترقی، ماحول، انتخاب کے انتظامات، اور انسانوں کی تجارت کے شعبوں میں مدد مانگی گئی۔ انسانی حقوق کے گروپوں نے اطلاع دی کہ عموماً انہیں پولیس اسٹیشنوں اور جیلوں تک رسائی کے معاملے میں آسانی رہی۔

حکومت نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی غیر سرکاری مبصروں کو ملک کے دورے کی اجازت دی۔ بعض اوقات حکومت نے بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے عہدے داروں کو ویزے جاری نہیں کیئے۔ ICRC اور اقوامِ متحدہ کی بہت سی ایجنسیوں کے دفاتر ملک میں موجود تھے۔ ان میں

UNHCR، اقوامِ متحدہ کا بچوں کا فنڈ (UNICEF)، اور UN Development Fund شامل ہیں۔ حکومت نے ICRC کو سوات اور صوبہ سرحد میں سیکیورٹی کی بنیاد پر قید کیئے ہوئے لوگوں تک رسائی کی اجازت نہیں دی۔ ICRC نے بلوچستان میں قیدیوں تک آزادنہ رسائی حاصل کرنے میں بھی دشواریوں کی اطلاع دی جہاں حکومت نے ان تک رسائی روک دی تھی، اور پنجاب میں، جہاں حکومت نے سیکیورٹی کی بنیاد پر قید کیئے لوگوں تک رسائی پر پابندیاں لگادی تھیں۔

قانون، انصاف اور انسانی حقوق کے بارے میں سینیٹ اور قومی اسمبلی کی اسٹینڈنگ کمیٹیوں نے بہت سے امور پر سماعتیں منعقد کیں۔ ان میں غیرت کے نام پر قتل، اور پولیس کی طرف سے توہینِ مذہب کے قانون اور حدود آرڈی نینس کا غلط استعمال شامل ہیں۔ ان کمیٹیوں کے ذریعے ان مسائل کے بارے میں عوام کو بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں، لیکن انھوں نے جو حتمی اقدامات کیئے وہ عام طور پر سرکاری پالیسی کے مطابق تھے، اور کمیٹیوں کے پاس عمومی جائزے کے سوا، کچھ اور کرنے کے لیئے وسائل دستیاب نہیں تھے۔ کئی پارٹیوں پر مشتمل پارلیمنٹ کے ارکان کے گروپ، The Parliamentarians' Commission for Human Rights نے بعض اہم شعبوں میں اصلاحات کے لیئے رائے ہموار کی۔

سیکشن 6 امتیازی سلوک، معاشرے میں عمومی زیادتیاں، اور انسانوں کی تجارت

آئین میں تمام شہریوں کو برابر قرار دیا گیا ہے اور نسل، مذہب، ذات، رہائش، یا مقامِ پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک کی ممانعت ہے۔ عملی طور پر، ان تمام عوامل کی بنیاد پر، بڑے پیمانے پر امتیازی سلوک عام تھا۔

عورتیں

اپنے شریکِ حیات کے سوا، زنا بالجبر، فوجداری جرم ہے۔ شادی شدہ فرد کی طرف سے جبری جنسی فعل کی بنا پر، یا ایسے کیس میں جب زنا بالجبر کا ارتکاب کرنے والے اور اس فعل کا شکار ہونے والے فرد کے درمیان شادی کا معاہدہ ہو چکا ہو لیکن باضابطہ شادی نہ ہوئی ہو، مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ اگرچہ زنا بالجبر کے واقعات اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے لیکن مقدمہ چلانے کی کارروائی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ عورتوں کی ترقی، سماجی بہبود، اور خصوصی تعلیم کی وزارت کو، غیر سرکاری تنظیموں کی مدد سے ان مسائل سے نمٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ 11 فروری کو، وفاقی شرعی عدالت نے ایک پچیس سالہ قانونی شق کو غیر قانونی قرار دے دیا جس کے تحت کسی ایسے شخص کو جس پر زنا بالجبر کا الزام ہو، اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اس عورت کی ساکھ کو جو اس زیادتی کا شکار ہوئی، اس قسم کی شہادت کے ذریعے بٹہ لگا سکے کہ اس کا "چال چلن عام طور سے خراب تھا۔"

The Women's Protection ACT (WPA) مجریہ 2006ء کے تحت زنا بالجبر کے جرم کو اسلامی عدالتوں کے بجائے فوجداری عدالتوں کے دائرہ اختیار میں شامل کر دیا گیا۔ زنا بالجبر سے متعلق حدود آرڈی نینس کی شقوں کے تحت، عورت لیئے لازم تھا کہ وہ اپنے الزام کی تصدیق کی لیئے چار مرد گواہ پیش کرے۔ WPA کے تحت، پولیس کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی عورت کو کسی سول کورٹ کے جج کی رضامندی کے بغیر گرفتار کرے یا پوری رات کسی پولیس اسٹیشن میں رکھے۔ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورتوں کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیئے، قانون کی ایک شق میں کہا گیا ہے کہ زنا بالجبر کے تمام کیسوں کی سماعت سیشنز جج کریں گے۔ عورتوں کے حقوق کے لیئے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں اس بات پر زور دیتی رہیں کہ اس قانون کے تحت زنا بالجبر کا شکار ہونے والی ایسی عورتوں کی راہ میں رکاوٹیں حائل کر دی گئی ہیں جن کے پاس پیسہ

نہیں ہوتا یا جو عدالتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔ عدالتوں نے زنا بالجبر کے کیس حدود آرڈی نینسوں کے بجائے WPA کے تحت لانا شروع کر دیے۔

زنا بالجبر کی کم سے کم سزا 10 سے 25 سال قید اور جرمانہ، اور زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہے۔ اجتماعی زنا بالجبر کی سزا یا تو موت یا عمر قید ہے، لیکن دی جانے والی سزائیں اکثر اس سے بہت کم سخت ہوتی تھیں۔

زنا بالجبر کے بارے میں قومی سطح پر کوئی قابلِ اعتماد اعداد و شمار دستیاب نہیں تھے، کیوں بہت کم کیسوں کی رپورٹنگ کی جاتی تھی۔

بعض اوقات پولیس زنا بالجبر کی وارداتوں میں ملوث ہوتی تھی۔ پولیس اکثر زنا بالجبر کا شکار ہونے والوں کے ساتھ زیادتی کی مرتکب ہوتی تھی یا انہیں دھمکیاں دیتی تھی اور مطالبہ کرتی تھی کہ وہ الزامات واپس لے لیں، خاص طور سے جب ملزموں نے پولیس کو رشوت دے دی ہو۔ زنا بالجبر کے الزامات درج کرنے سے پہلے، پولیس نے زنا بالجبر کا شکار ہونے والے بعض افراد سے رشوت طلب کی، اور تفتیش اکثر بالکل سطحی ہوتی تھی۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ بعض پولیس اسٹیشنوں نے زنا بالجبر کی شکایتیں درج کرنا بند کر دیں۔ طبّی عملے کو جرائم کی تفتیش کی کافی تربیت نہیں دی گئی تھی جس سے مقدمہ چلانے کی کارروائی میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

5 جون کو، لاہور ہائی کورٹ نے ایک پندرہ سالہ لڑکی کے مبینہ اجتماعی زنا بالجبر، اور قتل کے کیس کا جائزہ لیا۔ شیخوپورہ کی رہنے والی اس لڑکی کے ساتھ مبینہ طور پر ڈاکٹر افتخار احمد نے امین ہسپتال میں دوسرے لوگوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا تھا۔ اس کے بعد اسے زہر کا انجکشن دے دیا گیا۔ پولیس کے مطابق، ملزم سال کے آخر تک زیرِ حراست تھا۔

26 جولائی کو اخبار نیویارک ٹائمز کے ایک مضمون کے مطابق، دو افراد نے ایک 16 سالہ لڑکی آسیہ رفیق کو اغوا کیا اور اسے تقریباً آٹھ مہینے تک اپنے پاس رکھا۔ اس دوران انھوں نے اس کے ساتھ بار بار زنا بالجبر کیا۔ جب ان افراد نے اس لڑکی کو جنوبی پنجاب میں ضلع خانیوال کی پولیس کے حوالے کیا، تو مبینہ طور پر پولیس افسروں نے اسے 14 دن تک اپنی تحویل میں رکھا اور اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ 19 جون کو، ایک مقامی عدالت نے تفتیش کا حکم دیا اور آسیہ رفیق کو رہا کر دیا۔ سال کے آخر تک، کوئی گرفتاریاں نہیں ہوئی تھیں، اور مزید کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

AHRC کے مطابق، 5 اکتوبر کو پانچ افراد نے 16 سالہ روبی پروین کو بندوق کی نوک پر اغوا کیا اور اس کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر کیا۔ اگلے روز وہ شمالی سرگودھا میں ایک بس اسٹاپ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پائی گئی۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں تین مبینہ افراد۔۔ قیصر شہزاد، عدیل شہزاد، اور ارشاد۔۔ مبینہ طور پر ایک مقامی سیاسی پارٹی کے لیڈر کے بیٹے تھے۔ اگرچہ لڑکی کے اہلِ خانہ نے مقامی پولیس کے پاس FIR درج کرائی، لیکن کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ پولیس افسروں نے دعویٰ کیا کہ عدالت کے باہر کوئی تصفیہ کیا جا رہا تھا۔ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی لڑکی کے اہلِ خانہ نے اس دعوے کو مسترد کر دیا۔ سال کے آخر تک حکومت نے اس کیس میں مزید کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔

4 نومبر کو، کراچی میں ایک ضلعی عدالت نے، مارچ 2008ء میں مزارِ قائد کے علاقے میں، ایک اٹھارہ سالہ عورت کی اجتماعی زنا بالجبر کے کیس کی شہادتیں سنیں۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے تین افراد گرفتار کر لیئے گئے، اور سال کے آخر تک وہ جیل میں، مقدمہ چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

پاکستان

گوالمنڈی، لاہور میں، مئی 2008ء میں دو افراد کے ہاتھوں ایک سات سالہ لڑکی کے زنا بالجبر کے کیس میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ مشتبہ افراد کے خلاف کیس، جن میں سے ایک اس کا انکل تھا، سال کے آخر تک چل رہا تھا۔

اگست 2008ء کے کیس میں، جس میں کچھ لوگوں کے گروپ نے راولپنڈی میں اسکول کی ایک 13 سالہ طالبہ کو اغوا کیا، زنا بالجبر کیا اور اسے ہلاک کر دیا، کوئی گرفتاریاں نہیں ہوئی تھیں۔

پولیس نے 2008ء کے اس کیس میں کوئی گرفتاری نہیں کی جس میں منڈی بہاالدین، پنجاب میں ایک عورت کو کئی مردوں نے اغوا کیا، زنا بالجبر کیا، اور ہلاک کرنے سے پہلے اسے تیزاب سے بُری طرح جلایا۔ نہ ہی 2007ء کے اس کیس میں کوئی گرفتاری ہوئی جس میں ایک 17 سالہ لڑکی کے ساتھ شاہدرہ ٹاؤن، لاہور میں چار افراد نے اجتماعی زنا بالجبر کیا۔ سال کے دوران، 2007ء کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں ایک 16 سالہ لڑکی نسیمہ بانو کے ساتھ کم از کم آٹھ افراد نے سزا کے طور پر زنا بالجبر کیا۔ سال کے آخر تک آٹھ افراد جیل میں تھے۔

سال کے دوران، سپریم کورٹ کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی جو ان آٹھ افراد کے خلاف دائر کیا گیا تھا جو مختاراں مائی کے 2002ء کے اجتماعی زنا بالجبر کے کیس میں ملوث تھے۔ 2005ء میں سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ وہ پانچ افراد جن کی سزا یابی لاہور ہائی کورٹ نے مسترد کر دی تھی، دوبارہ گرفتار کر لیئے جائیں اور انہیں بلا ضمانت تحویل میں رکھا جائے۔ سال کے دوران، مائی پولیس کی حفاظت میں پنجاب میں اپنے گاؤں میں رہیں، اور وہ تیرہ افراد جو مبینہ طور پر ان کی اجتماعی آبرو ریزی میں ملوث تھے، جیل میں تھے۔

گھریلو تشدد بہت عام تھا اور سنگین مسئلہ تھا۔ اطلاعات کے مطابق، شوہروں نے اپنی بیویوں کو زدو کوب کیا اور کبھی کبھی ہلاک کر دیا۔ گھریلو تشدد کی دوسری صورتوں میں اذیت رسانی، اور بال مونڈھ دینا شامل تھا۔ شوہر کے رشتے داروں نے شادی شدہ عورتوں کے ساتھ بد سلوکی کی اور انہیں پریشان کیا۔ اکثر جہیز اور خاندانی جھگڑوں کے نتیجے میں عورتوں کو ہلاک کر دیا گیا یا جلا کر یا تیزاب سے ان کا چہرہ مسخ کر دیا گیا۔

عورت فاؤنڈیشن کے مطابق، پچھلے سال کے مقابلے میں عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات میں 13 فیصد اضافہ ہوا۔ عورت فاؤنڈیشن نے اطلاع دی کہ سال کے دوران، 1384 عورتیں ہلاک ہوئیں، 1,87 کو اغوا کیا گیا، 683 نے خود کشی کر لی، اور 928 کی آبرو ریزی یا اجتماعی آبرو ریزی کی گئی۔ اس کے علاوہ، عورت فاؤنڈیشن کے مطابق، گھریلو تشدد کے 608 واقعات، جنسی حملوں کے 274 واقعات، خود کشی کے 683 واقعات، اور اسٹوو سے جلنے کے 50 واقعات ہوئے۔

2008ء کی HRCP کی ایک رپورٹ کے مطابق، دیہی علاقوں میں 80 فیصد بیویوں کو اپنے شوہروں کی طرف سے تشدد کا خطرہ تھا، اور ترقی یافتہ شہری علاقوں میں تقریباً 50 فیصد نے اعتراف کیا کہ ان کے شوہر انہیں مارتے ہیں۔ HRCP نے 52 ایسے کیسوں کی اطلاع دی کہ عورتوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دی گئی۔ عورت فاؤنڈیشن نے اطلاع دی کہ سال کے دوران تیزاب سے حملوں کے 53 واقعات ہوئے جب کہ 2008ء میں ان کی تعداد 29 تھی۔

جن عورتوں نے بد سلوکی اور زیادتیوں کی اطلاع دینے کی کوشش کی انہیں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس اور ججوں کو گھریلو تشدد کے کیسوں میں کوئی اقدام کرنے میں تامل ہوتا تھا اور ان واقعات کو گھریلو مسائل سمجھا جاتا تھا۔ پولیس نے الزامات درج کرنے کے بجائے، عام طور سے فریقین کے تصفیہ کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جن عورتوں کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی، انہیں اکثر خاندان کے انہی ارکان کے پاس واپس بھیج دیا جاتا

تھا جنھوں نے ان کے ساتھ بد سلوکی کی تھی۔ عورتیں الزامات عائد کرنے سے گھبراتی تھیں کیوں کہ طلاق کو بدنامی کا باعث سمجھا جاتا ہے، اور وہ اقتصادی اور نفسیاتی طور پر اپنے رشتے داروں کے زیرِ کفالت ہوتی ہیں۔ رشتے دار خاندان کی بے عزتی کے ڈر سے بد سلوکی کی رپورٹ کرنے سے گھبراتے تھے۔

حکومت Crisis Center for Women in Distress چلاتی تھی جو زیادتیوں کا شکار ہونے والی عورتوں کو مدد کے لیئے غیر سرکاری تنظیموں کے پاس بھیجتے تھے۔ اندازاً 70 شیلٹر ہوم ضلع کی سطح پر چل رہے تھے، اور مصیبت زدہ عورتوں کے لیئے تقریباً 250 اداروں میں ایمرجنسی میں سر چھپانے کا انتظام تھا۔ ان میں عورتوں کے عملے والے پولیس اسٹیشن اور سماجی بہبود کے صوبائی محکموں اور غیر سرکاری تنظیموں کے زیرِ انتظام پناہ گھر شامل تھے۔ ضلع کے زیرِ انتظام چلنے والے مراکز رہائشی سہولت، علاج معالجے تک رسائی، محدود قانونی چارہ جوئی، اور کچھ پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرتے تھے۔

بعض کیسوں میں حکومت کے انتظام چلنے والی پناہ گاہوں میں عورتوں کے ساتھ زیادتی اور بد سلوکی کی گئی۔

2007ء کے اس کیس میں مزید پیش رفت نہیں ہوئی جس میں راولپنڈی میں ایک شخص نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے، اپنی 21 سالہ بیوی کو آگ لگا دی تھی۔ سال کے اختتام پر، جن دو افراد کو پولیس نے گرفتار کیا تھا، ان کا کیس راولپنڈی ڈسٹرکٹ کورٹ میں زیرِ سماعت تھا۔

سال کے دوران، پورے ملک میں غیرت کے نام پر قتل، اور اعضا کے مسخ کرنے کے واقعات ہوتے رہے۔ عورت فاؤنڈیشن نے اطلاع دی کہ سال کے دوران، غیرت کے نام پر 604 قتل ہوئے۔

2005ء کے ایک قانون کے تحت غیرت کے نام پر قتل کی سزائیں مقرر کی گئیں۔ انسانی حقوق کے گروپوں نے اس قانون پر تنقید کی کیوں کہ اس کے تحت، جرم کا شکار ہونے والا فرد یا اس کے ورثاء، جرم کا ارتکاب کرنے والے فرد کے ساتھ جسمانی یا مالی تلافی کا سودا کر سکتے ہیں اور اس سودے کے عوض الزامات واپس لے لیئے جاتے ہیں۔ اس قانون کو "قصاص" یا "دیت" کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ غیرت کے نام پر جرائم عام طور سے گھرانوں کے اندر ہوتے ہیں، اس لیئے جرم کرنے والے لوگ برائے نام ادائیگی کا سودا کر لیتے ہیں اور اس طرح زیادہ سخت سزا سے بچ جاتے ہیں۔

میڈیا کے رپورٹوں کے مطابق 24 اپریل کو عالیہ بی بی اور عظیم الحق کو PATA میں کالاڈھاکہ کے مقام پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ جوڑا خاندان سے چھپ کر فرار ہو گیا تھا اور ایک جرگے نے بعد میں انہیں موت کی سزا سنادی تھی۔ 26 فروری کو اپوری کی پولیس نے اس جوڑے کو شانگلہ میں گرفتار کر لیا اور انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد، انہیں اغوا کیا گیا اور کالاڈھاکہ لے جایا گیا جہاں جرگے نے پھانسی کی سزا پر عمل در آمد کر دیا۔ حکومت کے ایک نمائندے نے کہا کہ اگرچہ انہیں اس ہلاکت پر افسوس ہے، مگر اس علاقے میں جرگے کے نظام کو ہی قانونی حیثیت حاصل ہے۔

اخبار ڈان کے مطابق، 28 جون کو، مسلح افراد نے جن میں سے کچھ پولیس کی وردیوں میں تھے، چارسدّہ میں ایک نو بیاہتا جوڑے کے گھر پر حملہ کیا اور پانچ افراد کو ہلاک کر دیا۔ شوہر کے رشتے داروں کے مطابق، بعض مسلح افراد نے خود کو پولیس والے ظاہر کیا۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی اور اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دلہن کے رشتے دار دیوار پر چڑھے اور گھر میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے گولیاں چلانی شروع کر دیں اور دلہن کو،

اس کے شوہر کے والد، والدہ اور بہن کو ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ دلہن کے گھرانے کو اس بات پر غصہ تھا کہ اس جوڑے نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ اس کیس میں پولیس نے کسی کو گرفتار نہیں کیا۔

27 جولائی کو، سپریم کورٹ نے مارچ ء2008 کے تسلیم سولنگی کیس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ ایک 17 سالہ لڑکی تھی جو جرگے کے حکم پر غیرت کے نام پر قتل کا شکار ہو گئی۔ AHRC کے مطابق، اس پر کتوں نے حملہ کیا اور پھر اس کے شوہر کے رشتے داروں نے اسے ہلاک کر دیا۔ سپریم کورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس پر کتے نہیں چھوڑے گئے تھے۔

جولائی 2008ء کے اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں بابا کوٹ، بلوچستان میں دو نو عمر لڑکیوں اور تین عورتوں کو غیرت کے نام پر ہلاک کیا گیا تھا۔ جب میڈیا میں اس معاملے پر بحث شروع ہوئی اور سیاست دانوں اور انسانی حقوق کے گروپوں نے اس کی مذمت کی، تو وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت نے تفتیش شروع کی اور پولیس نے سات افراد کو شبہ میں گرفتار کر لیا۔ سال کے آخر تک یہ کیس عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔

اس کے باوجود کہ حریف قبائل کے جرائم کے عوض عورتوں کو حوالے کیا جانا (اسے "وانی" یا "سوارا" بھی کہتے ہیں) ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، یہ رواج پنجاب اور صوبہ سرحد میں جاری رہا۔

پارلیمنٹ نے 2007ء میں جبری شادیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا لیکن اس قانون کا نفاذ بدستور ایک مسئلہ رہا۔

عالمی بنک نے 2007ء میں ایک تحقیقی رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا ہے کہ دیہی علاقوں میں ایک تہائی شادیاں "وٹّے سٹّے" کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ یعنی یہ ادلے بدلے کی شادیاں ہوتی ہیں جس میں مرد ایک دوسرے کی بہنوں سے شادی کرتے ہیں۔ اس مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادلے بدلے کے اس رواج سے عورتوں کو کچھ تحفظ مل جاتا ہے۔ وٹے سٹے کی شادیوں میں شامل عورتوں کی ازدواجی زندگی میں اختلافات، گھریلو زیادتیوں، اور افسردہ کرنے والے بڑے واقعات کا امکان خاصا کم ہو جاتا ہے۔ انسانی حقوق کے گروپوں مثلاً HRCP نے اس رواج پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ "ان شادیوں میں عورتوں کو اشیاء کی طرح سمجھا جاتا ہے، اور ایک گھر میں کشیدگی ہوتی ہے تو اس سے دوسرا گھر بھی متاثر ہوتا ہے۔"

سندھ کے دیہات میں زمیندار خاندانوں میں "قرآن کے ساتھ شادی" کا رواج جاری رہا، تاکہ خاندانی جائداد تقسیم نہ ہو۔ جن عورتوں کی شادی قرآن کے ساتھ ہو جاتی ہے، ان کی جائداد ان کے باپ یا سب سے بڑے بھائی کے قانونی کنٹرول میں رہتی ہے، اور ایسی عورتوں کو 14 برس سے زیادہ عمر کے کسی مرد سے رابطہ کرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ ان عورتوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ گھر میں رہیں گی، اور اپنے گھرانے کے باہر کسی سے رابطہ قائم نہیں کریں گی۔

جسم فروشی غیر قانونی ہے۔ بیشتر جسم فروش عورتیں انسانوں کی ملکی یا بین الاقوامی تجارت کا شکار ہوئیں اور انہیں ان کی مرضی کے خلاف یہ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پولیس عام طور سے اس کاروبار کو نظر انداز کر دیتی تھی اگر اسے رشوت ملتی رہتی۔ پولیس نے سال کے دوران قحبہ خانوں پر چھاپے مارے لیکن یہ کام، خاص طور سے بڑے شہروں میں، چوری چھپے جاری رہا۔

پاکستان

عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں اور پریشان کیا جانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا جو عورتوں کو کام کی جگہ پر تحفظ فراہم کرتا۔ پریس کی رپورٹوں کے مطابق، جنسی طور پر تنگ کرنے کے واقعات خاص طور سے گھریلو ملازماؤں اور نرسوں میں بہت زیادہ تھے۔ اگرچہ فوجداری قانون کے تحت پریشان کرنا منع ہے، لیکن شاذو نادر ہی کسی پر مقدمہ چلایا جاتا تھا۔

AHRC کے مطابق، 11 مئی کو اسلام آباد میں دنیا ٹیلیویژن نیوز کی سینیئر میزبان، ماہین عثمانی کو اس چینل کے مینیجنگ ڈائریکٹر یوسف بیگ مرزا کی جانب سے رات گئے دو ٹیلیفون آئے جن میں انھوں نے غیر شائستہ باتیں کہیں۔ عثمانی نے چینل کے ڈائریکٹر آف نیوز اور چیف ایگزیکیوٹو افسر کو مطلع کیا لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ عثمانی نے دعویٰ کیا کہ اس کے بعد انہیں پیشہ ورانہ طور پر غیر منصفانہ سلوک کا تجربہ ہوا، اور 15 جون کو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے اپنے استعفے میں "مسلسل ستائے جانے، دباؤ ڈالے جانے، اور دنیا نیوز کی اعلیٰ انتظامیہ کے انتہائی غیر اخلاقی طرزِ عمل" کا حوالہ دیا۔ ایک داخلی تفتیشی کمیٹی اور نیشنل پریس کلب نے ان کی شکایت کی تفتیش کی، لیکن سال کے آخر تک اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ مرزا نے عثمانی کے خلاف ہتکِ عزت کے دو مقدمے دائر کر دیے۔ عثمانی کو پیسوں اور ملازمتوں کی پیشکش کی گئی ہے اگر وہ یہ کیس ختم کر دیں۔

شادی شدہ جوڑوں اور افراد کو بچوں کی تعداد، پیدائش میں وقفے اور ان کے اوقات کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا، اور انہیں کے پاس اس بارے میں، کسی امتیاز کے بغیر، معلومات اور ذرائع موجود تھے۔ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو خاص طور سے جنسی اور بچوں کی پیدائش سے متعلق صحت کے مسائل اور حقوق کے سلسلے میں مسائل پیش آ سکتے تھے۔ National Committee for Maternal and Neonatal Health کے مطابق، بچے پیدا کرنے والی عمر کی صرف 30 فیصد عورتیں کوئی مانع حمل طریقہ استعمال کرتی تھیں، اور ان میں سے ایک چوتھائی عورتیں حمل روکنے کے روایتی طریقے استعمال کرتی تھیں جو جدید مانع حمل چیزوں کے مقابلے میں کم موثر ہیں۔ دیہی علاقوں میں بہت کم عورتوں کو بچے کی پیدائش کے دوران دیکھ بھال کرنے والے تربیت یافتہ افراد کی مدد دستیاب تھی۔ ان میں پیدائش کے دوران جراحت کی سہولتیں، اور بعد وضع حمل، دیکھ بھال کے انتظامات بھی شامل ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں، عورتوں میں HIV سمیت جنسی افعال کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کا امکان کم تھا۔

قانون کے تحت جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک کی ممانعت ہے، لیکن عام زندگی میں اس شق پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتوں کو خاندانی قانون، املاک کے قانون، اور عدلیہ کے نظام میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

عائلی قوانین میں طلاق کی صورت میں، عورتوں کے تحفظ کے انتظامات موجود ہیں۔ ان میں نان نفقے کی فراہمی، شامل ہے۔ قانون میں نابالغ بچوں کی تحویل اور ان کے گذارے کے اخراجات کے واضح رہنما اصول بھی موجود ہیں۔ بہت سی عورتیں ان قانونی تحفظات سے بے خبر تھیں یا وہ ان پر عمل درآمد کے لیئے قانونی مشورہ حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ مطلقہ عورتیں اکثر اپنے گذارے کے لیئے کسی مدد کے بغیر رہ جاتی تھیں، اور ان کے گھرانے کے لوگ ان سے میل جول ترک کر دیتے تھے۔ اگرچہ قانون کے تحت اس کی ممانعت ہے لیکن دیہی علاقوں میں دلہنوں کی خرید و فروخت کا رواج جاری رہا۔ قانونی طور پر عورتوں کو اپنے گھرانے کی رضامندی کے بغیر شادی کرنے کی اجازت ہے، لیکن جو عورتیں ایسا کرتی تھیں، ان کا معاشرتی مقاطعہ ہو جاتا تھا یا انہیں غیرت کے نام پر قتل کر دیا جاتا تھا۔

وراثت کے قانون میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں ورثے میں نصف حصہ ملتا ہے۔ بیویوں کو اپنے شوہر کی املاک میں آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ عملی طور پر، عورتوں کو وراثت میں اس سے کہیں کم حصہ ملتا ہے جس کی وہ قانونی طور پر حقدار ہیں۔

عورتوں کو ملازمتوں اور روزگار کے معاملے میں شدید امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں اکثر ایک جیسے کام کے لیئے مردوں کے مقابلے میں کم معاوضہ دیا گیا۔ ملک کے بہت سے دیہی علاقوں میں، معاشرے کے سخت دباؤ کی وجہ سے عورتیں گھر کے باہر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ بعض قبائل نے رشتے داروں کے سوا، عورتوں کو مردوں سے مکمل طور پر الگ رکھنے کا روایتی طریقہ جاری رکھا۔

عورتوں کے حقوق کے لیئے کام کرنے والی بہت سی غیر سرکاری تنظیمیں جیسے سحر Progressive Women's Association , Struggle, for Change, War against Rape اور عورت فاؤنڈیشن، شہری علاقوں میں سرگرم تھیں۔ گھریلو تشدد اور غیرت کے نام پر کیئے والے جرائم، ان کی توجہ کا مرکز تھے۔

بچے

شہریت کا حق ملک کی حدود کے اندر پیدائش کے ذریعے ملتا ہے۔ پیدائش کی اطلاع دینا رضاکارانہ ہے، اور ملک میں، خاص طور سے دیہی علاقوں میں ریکارڈز کسی ایک طریقے سے نہیں رکھے جاتے۔ پیدائش کے سرٹیفیکٹ کے بجائے، بہت سے افراد اسکول کے ریکارڈز استعمال کرتے ہیں جس کی تصدیق اسکول کے ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کرتے ہیں، یا میٹرک کا سرٹیفیکٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دونوں سرٹیفکٹوں میں باپ کا نام اور تاریخِ پیدائش درج ہوتی ہے۔

حکومت نے اپنے قوانین اور پروگراموں کے ذریعے، سال کے دوران بچوں کے حقوق اور ان کی بہبود کے تحفظ میں کچھ پیشرفت کی، لیکن مسائل بدستور موجود رہے۔ دہشت گردی اور منشیات سے متعلق جرائم میں نابالغوں کو Juvenile Justice System Ordinance کے تحت تحفظ حاصل نہیں تھا۔ بچوں کے حقوق کے تحفظ کی سوسائٹی (SPARC) نے اطلاع دی کہ 12 سال کی عمر تک کے بچوں کو انسدادِ دہشت گردی کے قانون کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس قانون کے تحت سزا پانے والے بچوں کو موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔

مقامی قوانین کے تحت مفت سرکاری تعلیم لازمی نہیں ہے، اور اسکول عام طور سے ٹیوشن فیس وصول کرتے تھے۔ سرکاری اسکول، خاص طور سے پرائمری گریڈز سے اوپر، بہت سے دیہی علاقوں میں دستیاب نہیں تھے۔ کم تر درجے کی سماجی اور اقتصادی حیثیت کے والدین اکثر اپنے بچوں کو مدرسوں میں بھیجتے تھے جہاں انہیں مفت رہائش اور کھانا ملتا تھا۔ شہری علاقوں میں، بعض والدین سرکاری اسکولوں کے فقدان اور ان کی تعلیم کے خراب معیار کی وجہ سے، اپنے بچوں کو پرائیویٹ اسکولوں میں بھیجتے تھے۔

AFP کے مطابق، عسکریت پسندوں نے ملک کے شمال مغربی علاقے میں، سینکڑوں اسکول، خاص طور سے لڑکیوں کے اسکول تباہ کر دیے۔ مثال کے طور پر، یکم نومبر کو، عسکریت پسندوں نے خیبر قبائلی ضلع کے کاریگر گاؤں میں، لڑکیوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بم کا دھماکہ کیا۔ اسکول کی عمارت تباہ ہو گئی اور چار افراد زخمی ہوئے۔ گذشتہ دو برسوں میں، عسکریت پسندوں نے طالبان کی بغاوت کے دوران وادئ سوات میں 200 اسکول تباہ کر دیے۔

پاکستان

اگرچہ سرکاری اداروں میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو برابر کی رسائی حاصل تھی، لیکن خاندانوں میں لڑکوں کے لیئے طبّی سہولتیں حاصل کرنے کا امکان زیادہ تھا۔

بچوں کے ساتھ زیادتیاں عام تھیں۔ایک غیر سرکاری تنظیم Lawyers for Human Rights and Legal Aid (LHRLA) نے اطلاع دی کہ جنوری سے نومبر تک کے عرصے میں، 612 بچوں کو ہلاک کیا گیا، 274 کے ساتھ اغلام بازی کی گئی، 963 کو اغوا کیا گیا، 374 کو فروخت کیا گیا، اور 1054 لاپتہ ہو گئے۔

لڑکوں کی شادی کی قانونی عمر 18 برس اور لڑکیوں کی 16 برس ہے۔ان قوانین کے باوجود جن کے تحت بچوں کی شادی ممنوع ہے، اس بات کا ثبوت موجود تھا کہ ایسی شادیاں ہوتی رہیں۔ LHRLA نے 1006 جبری اور "ونی" کی شادیوں کی اطلاع دی۔مارچ 2008ء میں فیملی پلاننگ ایسو سی ایشن آف پاکستان نے اندازہ لگایا کہ ملک میں 32 فیصد شادیاں بچوں کے درمیان ہوتی ہیں۔2007ء میں اسلام آباد میں انسانی حقوق کے ایک سیمینار میں، شرکاء نے یہ بات نوٹ کی کہ سندھ کے کچھ حصوں اور صوبہ سرحد میں، بارہ سالہ لڑکی 90,000 سے 200,000 روپے ($1,140 to $2,540) میں خریدی جا سکتی تھی۔ دیہی علاقوں میں غریب والدین نے بچوں کو جبری مزدوری کے لیئے بیچا اور لڑکیوں کو شادی کے لیئے فروخت کر دیا۔

2008ء میں ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ (EWT) نے کہا کہ وہ ہر ماہ کراچی میں کوڑے کے ڈھیروں سے اور ملک کے دوسرے حصوں سے کوڑے کے ڈرموں سے 30 شیر خوار بچوں کو زندہ نکالتے ہیں اور انہیں اس سے چار گنا تعداد میں شیر خوار بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔انھوں نے بتایا کہ 1970ء سے اب تک وہ 68000 شیر خوار مردہ بچوں کو کوڑے کے ڈھیروں سے نکال چکے ہیں۔ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کے مطابق، جن شیر خوار بچوں کو زندہ پھینک دیا گیا تھا یا ہلاک کر دیا گیا تھا، ان میں سے 98 فیصد لڑکیاں تھیں۔

بے گھر ہونے والے (IDPs) بچوں کو سرکاری سہولتوں کی فراہمی پر کوئی پابندیاں علم میں نہیں آئیں، اگرچہ سول سوسائٹی کے بعض تنظیموں نے ان سہولتوں میں بہتری کا مطالبہ کیا۔

بچوں کی خرید و فروخت اور تجارتی پیمانے پر ان کا جنسی استحصال کے مسائل موجود تھے۔ایک غیر سرکاری تنظیم، ساحل کے مطابق، جو بچوں کے جنسی استحصال پر توجہ مرکوز کرتی ہے، بچوں سے جسم فروشی کے کام میں کوئی تیسرا فریق ملوث ہوتا تھا بجائے اس کے کہ بچے اپنی بقا کی خاطر خود جسم فروشی کرتے ہوں۔

میڈیا رپورٹوں کے مطابق، طالبان عسکریت پسندوں نے جبراً بچوں کو سپاہیوں کے طور پر بھرتی کیا۔*The Times* نے 28 جولائی کو اطلاع دی کہ فروری میں جب حکومت نے طالبان کے ساتھ امن سمجھوتے پر دستخط کر دیے، تو مذہبی عسکریت پسندوں نے مبینہ طور پر سوات میں 1,200 اور 1,500 بچوں کو، جن میں سے بعض کی عمر صرف 11 سال تھی، خودکش بمباروں کی تربیت دینے کے لیئے اغوا کر لیا۔ جولائی میں فوج نے اس وقت پانچ نوجوان لڑکوں کو بازیاب کیا جب سوات میں فوجی کارروائی کے بعد، وہ تربیتی کیمپ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے جہاں انہیں رکھا گیا تھا۔ فوج نے بازیاب ہونے والے بچوں کی بحالی کے لیئے ایک مرکز قائم کیا۔BBC نے بھی 2007ء میں طالبان کی اسی قسم کی سرگرمیوں کی اطلاع دی تھی۔

پاکستان

SPARC کے اندازے کے مطابق 2008ء میں 150,000 سے زیادہ بچے شہری علاقوں کی سڑکوں پر رہتے تھے۔

فوجداری قانون میں قانونی طور سے زنا بالجبر کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ یہ ایسی جنسی مباشرت ہے جو 16 برس سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ کی جائے۔ زنا بالجبر کی سزا موت یا 10 سے 25 سال کی سزا اور جرمانہ ہے۔ اجتماعی زنا بالجبر کی سزا موت یا عمر قید ہے۔ فحاشی کے عام قانون کے تحت بچوں کی ساتھ فحاشی غیر قانونی ہے۔

انسانوں کی تجارت

قانون کے تحت ملک کے اندر اور بین الاقوامی انسانی تجارت ممنوع ہے، لیکن ایسی رپورٹیں ملیں کہ ملک کے اندر خریدے ہوئے افراد لائے گئے، ملک سے باہر بھیجے گئے اور خود ملک کے اندر خرید و فروخت ہوئی۔

انسانوں کی تجارت کے لیئے ملک اہم ذریعہ تھا اور اسے آمد و رفت کے پوائنٹ کے طور پر، خریدے ہوئے لوگوں کی منزل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ملک کے اندر انسانوں کی خرید و فروخت سنگین مسئلہ تھا۔ اطلاع کے مطابق، اس کاروبار میں دس لاکھ مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے۔ مردوں اور عورتوں کو ملک سے مشرق وسطیٰ بھیجا جاتا تھا جہاں ان سے غلاموں کی طرح مشقت لی جاتی تھی، اور جنسی مزدوروں کی طرح یا گھریلو غلامی کے لیئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ملک بنگلہ دیش، بھارت، برما، افغانستان، سری لنکا، نیپال اور وسط ایشیا سے تجارتی پیمانے پر جنسی استحصال کے لیئے اور جبری مشقت کے لیئے لائی ہوئی عورتوں اور بچوں کی منزل بھی تھا۔ بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، اور برما، اور مشرقی ایشیا کے ملکوں کی عورتوں کو پاکستان کے راستے خلیج کے ملکوں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ انسانوں کی تجارت کرنے والے افراد، خریدے ہوئے انسانوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے میں آسانی کے لیئے امیگریشن کے عہدے داروں اور پولیس کو رشوت دیتے تھے۔ انسانی تجارت کا شکار ہونے والے بیرونی ملکوں کے لوگ جب واپس بھیجے جاتے تھے تو انہیں اپنے ملک میں معاشرے کے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

انسانوں کی تجارت کی زیادہ سے زیادہ سزا سات سے 14 برس تک کی قید اور جرمانہ ہے۔ FIA کے Anti-Trafficking Unit کے پاس انسانوں کی بین الاقوامی تجارت کو ختم کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ حکومت نے انسانوں کی تجارت کی بین الاقوامی تفتیش میں، اومان، برطانیہ، ایران، ترکی، یونان، اور آسٹریلیا جیسے ملکوں کی بھی مدد کی۔

حکام نے سال کے دوران انسانوں کی اسمگلنگ اور تجارت کے تقریباً 4,599 کیس رجسٹر کیئے۔ اس میں تجارت کے کیس بھی شامل ہیں کیوں کہ FIA کے پاس انسانوں کی تجارت اور اسمگلنگ کی الگ الگ شناخت کے وسائل نہیں تھے۔ سال کے دوران، حکام نے تقریباً 5,500 ایسے افراد کا پتہ چلایا اور انہیں گرفتار کیا جو غیر قانونی راستوں سے سفر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 2008ء میں FIA کے انسانی تجارت کے سیل نے اندازہ لگایا کہ 700 افراد نے جعلی یا دھوکے سے حاصل کیئے ہوئے کاغذات کے ذریعے ملک چھوڑنے کی کوشش کی۔

دیہی علاقوں سے عورتوں اور بچوں کو جنسی استحصال اور دوسری اقسام کی مشقت کے لیئے ملک کے اندر شہری علاقوں میں منتقل کر دیا گیا۔ اینٹوں کے بھٹوں، قالین کی بنائی، اور زراعت میں بچوں سے غلاموں کی طرح مشقت لینا، سنگین مسئلہ رہا۔ بعض کیسوں میں خاندانوں نے بچوں کو غلامی میں بیچ دیا یا انھوں نے یہ سمجھا کہ وہ اپنے بچوں کی شادی کر رہے ہیں یا انہیں کسی قانونی روزگار کے لیئے بھیج رہے ہیں، لیکن بعض دوسرے کیسوں میں بچوں کو اغوا کر لیا گیا۔

پاکستان

میڈیا نے 4 اپریل کو اطلاع دی کہ انسانوں کی اسمگلنگ کرنے والوں نے 100 سے زیادہ افغان باشندوں کو ایران اسمگل کرنے کے لیئے ایک شپنگ کنٹینر میں پیک کر دیا تھا۔ 52 افغان دم گھٹ کر ہلاک ہو گئے اور بقیہ 51 کوئٹہ میں ہزار گنجی کے بس ٹرمینل پر بے ہوش پائے گئے۔ 27 جولائی کو، FIA نے انسانوں کی تجارت کرنے والے گروہ کے ایک اہم رکن کو واہ کینٹ پولیس اسٹیشن کے دائرہ اختیار میں چاچی محلے سے گرفتار کیا جو مبینہ طور پر اسمگلنگ کے آپریشن میں ملوث تھا۔ سال کے آخر تک کوئٹہ کے عدالتی نظام میں اس کیس پر کارروائی جاری تھی۔

2005ء میں مرکزی حکومت نے اسلام آباد میں خاص طور سے انسانوں کی تجارت کا شکار ہونے والوں کے لیئے ایک ماڈل پناہ گاہ قائم کی۔ ملک بھر میں 200 سے زیادہ پناہ گاہیں انسانوں کی اسمگلنگ کا شکار ہونے والوں کو سہولتیں فراہم کر رہی ہیں۔ ان میں سندھ میں حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے کیمپ بھی شامل ہیں جو قرض کے عوض غلامی میں دیے ہوئے مزدوروں کے لیئے ہے۔ سال کے دوران حکومتِ پنجاب نے ایک پراجیکٹ شروع کیا جس کا مقصد لاہور اور قصور کے ضلعوں میں اینٹوں کے بھٹوں میں غلامی میں دیے ہوئے مزدوروں کے استعمال کو ختم کرنا تھا۔ حکومتِ سندھ نے بھی 2008ء کے آخر میں سرکاری زمینیں غریب مزدوروں میں تقسیم کرنے کا ایک پراجیکٹ شروع کیا، جس میں خاص توجہ عورتوں پر دی گئی۔ یہ پراجیکٹ ان کوششوں کا حصہ تھا جن کا مقصد مزدوروں کی غلامی کے رواج کو کم کرنا تھا۔ وفاقی حکومت نے بھی انسانی تجارت کا شکار ہونے والے غیر ملکی باشندوں کو عارضی رہائشی کا درجہ فراہم کیا۔

وفاقی حکومت نے، یونیسیف اور متحدہ عرب امارات کے تعاون سے ان بچوں کو واپس لانے اور ان کی بحالی کے لیئے کام کیا جنہیں اونٹوں کی دوڑ میں جاکی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کوششوں کی بدولت، 2005ء سے اب تک، 700 بچے واپس لائے جا چکے ہیں۔ FIA نے متحدہ عرب امارات کی طرف سے ہرجانے کی رقم کی ادائیگی میں سہولت فراہم کی۔

انسانوں کی تجارت کے بارے میں امریکی محکمۂ خارجہ کی سالانہ رپورٹ اس پتے پر دیکھی جا سکتی ہے: www.state.gov/g/tip

معذوریوں والے افراد

قانون کے تحت معذوریوں والے افراد کو دوسرے لوگوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ وفاقی اور صوبائی سطحوں پر ملازمتوں کے کوٹے مقرر ہیں جن کے تحت سرکاری اور نجی تنظیموں میں کم از کم 2 فیصد ملازمتیں معذوریوں والے افراد کے لیئے مخصوص ہیں۔ عملی طور پر، صرف جزوی طور پر ہی اس حق کی حفاظت کی گئی کیوں کہ اس پر عمل درآمد کے لیئے موثر طریقہ کار موجود نہیں۔ جسمانی اور دماغی معذوریوں والے افراد کی دیکھ بھال ان کے گھرانے کرتے تھے۔ بعض کیسوں میں، جرائم پیشہ افراد نے معذوریوں والے افراد کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا، اور انہیں ملنے والے بیشتر پیسے خود لے لیئے۔

معذوریوں والے افراد کو ملازمتیں دینے سے انکار کرنے والی تنظیمیں، ملازمتیں دینے کے بجائے معذوروں کی مدد کے فنڈ میں جرمانہ ادا کرنے کا انتخاب کر سکتی تھیں۔ National Council for the Rehabilitation of the Disabled نے ملازمتیں اور قرضے فراہم کیے اور اس کے علاوہ گذارے کے لیئے رقم دی۔ یہ کونسل Pakistan Society for the Rehabilitation of the Disabled بھی چلاتی تھی جو معذوریوں والے افراد کی بحالی میں امداد، پیشہ ورانہ تربیت اور طبّی امداد فراہم کرتی تھی۔

پاکستان

10 اگست کو صدر زرداری نے "Special Persons-Special Cards" کے پروگرام کا آغاز کیا جس کے تحت معذوریوں والے افراد کو آمد و رفت اور مالی سہولتوں سمیت کئی خدمات کم قیمت پر فراہم کی گئیں۔ اس پروگرام کے تحت معذوروں کی عوامی سہولتوں تک بہتر رسائی کے لیئے اقدامات کیئے گئے۔

معذوریوں والے افراد کے ووٹ دینے یا سول معاملات میں شرکت کرنے کے حقوق پر کوئی پابندیاں نہیں تھیں۔

قومی/نسلی/گروہی اقلیتیں

نجی محفلوں میں عام طور سے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ قومی، نسلی، اور گروہی اقلیتوں کے خلاف منظّم انداز سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن ان اقسام کے امتیازی سلوک کے بارے میں کافی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں جن کی بنیاد پر اس بارے میں واضح اور صحیح اطلاع دی جاسکے۔

جنسی رجحانات اور جنس کی شناخت کی بنا پر معاشرے میں ہونے والی زیادتیاں، امتیازی سلوک، اور پُر تشدد کارروائیاں

ہم جنس پرستوں کے درمیان مباشرت فوجداری جرم ہے؛ عملی طور سے حکومت نے اس قسم کے کیسوں پر شاذ و نادر ہی کبھی عدالتی کارروائی کی ہو۔ ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں نے اپنے جنسی رجحانات کا انکشاف شاید ہی کبھی کیا ہو، اور سال کے دوران، جنسی رجحان کی بنیاد پر امتیازی سلوک کے کوئی مقدمے عدالتوں میں نہیں لائے گئے۔

معاشرے میں عام طور سے زنانوں، مخنثوں اور مردوں اور عورتوں دونوں کی خصوصیات رکھنے والے لوگوں کو، جن کے لیئے ہیجڑے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، بیزاری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ اکثر ایک ساتھ مِل کر پسماندہ بستیوں میں رہتے ہیں اور بھیک مانگ کر اور میلوں ٹھیلوں یا شادیوں میں رقص کے ذریعے گذارہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ جسم فروشی بھی کرتے ہیں۔ ہیجڑوں کو اکثر اسکولوں میں یا ہسپتالوں میں داخلوں سے محروم کر دیا جاتا تھا، اور مکانوں کے مالک اکثر انہیں مکان کرایے پر دینے یا انہیں املاک بیچنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کے گھرانے انہیں اکثر ورثے میں ملنے والی املاک میں ان کا جائز حق نہیں دیتے تھے۔

14 جولائی کو سپریم کورٹ کی طرف سے بیان جاری ہوا کہ ہیجڑے ملک میں برابر کے شہری ہیں۔ عدالت نے حکم دیا کہ سماجی بہبود کے صوبائی محکمے ہیجڑوں کا سروے کریں اور انہیں رجسٹر کریں اور انہیں حکومت کے مالی امداد کے نظام کے تحت ملنے والے فوائد فراہم کریں۔ 23 دسمبر کو عدالت نے حکام کو حکم دیا کہ ہیجڑوں اور مخنصوں کو ایک الگ جنس کے طور پر اپنی نشاندہی کرنے کی اجازت دی جائے، اور حکومت کو حکم دیا کہ اس کمیونٹی کے لوگوں کو شناختی کارڈ جاری کیئے جائیں۔ سپریم کورٹ نے یہ حکم بھی دیا کہ ضلعی انتظامیہ ان کے خاندانوں کا پتہ چلائے اور انہیں وراثت میں اپنا حق حاصل کرنے میں ان کی مدد کرے۔

معاشرے میں دوسرے اقسام کا تشدد اور امتیازی سلوک

حکومت کے نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام (NACP) کے مطابق، سرکاری ملازمتوں میں ایچ آئی وی/ایڈز کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ ایچ آئی وی/ایڈز سے متاثر افراد کے بارے میں معاشرے کے رویوں میں تبدیلی آرہی ہے، لیکن معاشرتی سطح پر ایچ آئی وی/ایڈز کے مریضوں کے ساتھ امتیازی سلوک برقرار رہا۔ ایچ آئی وی/ایڈز کے مریضوں کو بدنامی کا جو خوف ہوتا ہے، اس کی وجہ سے امتیازی سلوک کے واقعات کے

بارے میں اکثر کوئی رپورٹ نہیں کی گئی۔ NACP نے اندازہ لگایا ہے کہ ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد جنہیں HIV وائرس لگ چکا ہے، 97,500 ہے اور ان میں سے صرف 5 فیصد کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے۔ علاج معالجے کے مراکز کھولنے کے علاوہ، NACP نے بچوں کی پیدائش پر کنٹرول اور ایڈز کے بارے میں واقفیت بڑھانے کے لیئے جلسے کیئے، عوامی مہمیں چلائیں اور مسجدوں میں تقریریں کیں۔

سیکشن 7 کارکنوں کے حقوق

غیر سرکاری تنظیموں اور اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق، ملک میں مزدور کارکنوں کی کُل تعداد 5 کروڑ 18 لاکھ ہے۔ مزدور گروپوں اور انٹر نیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کُل لیبر فورس کا تقریباً 3 فیصد حصہ مزدور یونینوں میں شامل تھا۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ " قانون کے تحت لگائی ہوئی معقول پابندی کے ساتھ، ہر شہری کو انجمنیں یا یونینیں بنانے کا حق حاصل ہوگا۔"

نومبر 2008 میں پارلیمینٹ نے عبوری Industrial Relations Act 2008 (IRA) بنایا، جو دسمبر 2008 میں موئثر ہو گیا۔ اس قانون کی مدت اپریل 2010 میں ختم ہونا تھی۔ اس نئے قانون کے تحت مزدروں سے متعلق پچھلا قانون، the Industrial Relations Ordinance of 2002 (IRO) منسوخ ہو گیا۔ اگرچہ اس IRA نے مزدور یونینوں کی تشکیل کے حق کو وسعت دی اور اسے مزدوروں کے مزید کئی شعبوں تک بڑھایا، پھر بھی مزدور گروپوں کی یہ تشویش برقرار رہی کہ IRA کا مسودہ تیار کرتے وقت، سہ فریقی مشاورت بہت محدود تھی اور لیبر فورس کے بہت سے بڑے بڑے شعبوں کو اس قانون سے الگ رکھنے کا سلسہ جاری رہا۔

a۔ انجمن سازی کا حق

آئین میں انجمن سازی کے حق کو تحفظ دیا گیا ہے، لیکن 1973 کے Civil Servants Act کے مطابق سرکاری ملازمین ایسوسی ایشنیں بنا سکتے ہیں، اور ٹریڈ یونینیں نہیں بنا سکتے اور نہ ان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ 2008 کے IRA کے تحت مزدوروں اور نجی شعبے کے آجروں کے ایسوسی ایشنیں بنانے کے حق کو وسعت دی گئی لیکن اس حق سے فلاحی تنظیموں، خود اپنا کاروبار کرنے والے کارکنوں، زرعی اور دوسرے غیر رسمی شعبے کے کارکنوں، ملک کے 12 ایکسپورٹ پروسیسنگ زونوں (EPZs) میں کام کرنے والے 15,000 سے زیادہ کارکنوں، اور سرکاری شعبے کے بیشتر ملازمین، بشمول طبّی عملہ، آگ بجھانے والے، ٹیچرز، اور سرکاری ملکیت کے اداروں میں کام کرنے والے کارکنوں کو الگ رکھے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ IRA کے تحت، EPZ کے کارکنوں کو یونینوں میں شامل ہونے، اجتماعی سودے بازی کرنے، یا ہڑتال کرنے کی ممانعت ہے۔ EPZ اتھارٹی کو EPZs کے اندر مزدوروں کے بارے میں قوانین کے مسودہ بنانے کا اختیار ہے، لیکن ایسے کسی قوانین کا مسودہ تیار نہیں کیا گیا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں اور حکومت نے جو سروے کیئے ہیں ان کے مطابق، ملک کی تقریباً 45 فیصد لیبر فورس زراعت میں کام کرتی ہے جب کہ 20 فیصد دوسرے چھوٹے موٹے شعبوں سے منسلک ہے۔ اس طرح ملک کی 65 فیصد سے زیادہ لیبر فورس کو انجمن سازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ عملی طور پر، 2008 کے IRA کو بنے ہوئے اتنے کم دن ہوئے تھے کہ اس پر عمل درآمد کے بارے میں کوئی رائے دینا ممکن نہیں تھا، اور چونکہ اس کی نوعیت عبوری تھی، اس لیئے لیبر گروپوں نے اس کے اثرات پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔

2008 کے IRA نے رکنیت اور شراکت پر حکومت کے کنٹرول کو کم کرنے کے لیئے مثبت اقدامات کیئے۔ اس مقصد کے لیئے اجتماعی سودے بازی کے ایجنٹوں کے لیئے یہ شرط ختم کر دی گئی کہ وہ کسی قومی سطح کی رجسٹرڈ فیڈریشن کے ساتھ وابستہ ہوں۔ IRA کے تحت ٹریڈ یونینوں کو اپنی مرضی کی

پاکستان

کسی بھی فیڈریشن یا کنفیڈریشن کے ساتھ الحاق کا حق حاصل ہے۔ IRO کے برعکس، IRA کے تحت، ٹریڈ یونینوں کے رجسٹرار کسی ٹریڈ یونین کی رجسٹریشن منسوخ نہیں کر سکتے۔ ایسے واقعات کی کوئی رپورٹیں نہیں ملیں جن میں حکومت نے ضابطے کی کارروائی کے بغیر کسی یونین کو کالعدم قرار دیا ہو۔

انٹرنیشنل ٹریڈ یونین کنفیڈریشن (ITUC) کے مطابق، IRA مزدوروں کے ان حقوق کو صاف الفاظ میں بیان نہیں کرتا کہ انہیں دوسرے مزدوروں کی ہمدردی میں ہڑتال کرنے کے حقوق حاصل ہیں، اور IRA کے تحت، ہڑتال کا قانونی طور پر اعلان کرنے میں کم از کم ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔ وفاقی حکومت کو ہڑتال کو ممنوع قرار دینے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں، اگر اس کی مدت 30 دن سے زیادہ ہو، اور اس کے نتیجے میں " کمیونٹی کے لیئے سنگین مسائل پیدا ہوتے ہوں"، یا اس سے "ملکی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو۔" عوام کو ضروری سہولتیں فراہم کرنے والے اداروں میں، ہڑتال شروع ہونے سے پہلے یا بعد میں کسی بھی وقت اس کی ممانعت کی جا سکتی ہے۔ 1999 کے Anti-Terrorist Ordinance میں غیر قانونی ہڑتالوں، پکٹنگ، اور دوسرے اقسام کے احتجاجوں کو "آبادی میں اضطراب" کا نام دیا گیا ہے جس کی سزا عمر قید تک ہے۔ ضابطہ فوجداری کے قانون کے سیکشن 144 کے مطابق بھی چار یا چار سے زیادہ افراد کے اجتماع کے لیئے پولیس کی اجازت ضروری ہے۔ حکام نے اس شق کو بھی ٹریڈ یونینوں کے اجتماعات کے خلاف استعمال کیا ہے۔ پچھلے برسوں میں، the Essential Services (Maintenance) Act of 1952 (ESMA) کو سرکاری شعبے کے کارکنوں کی ہڑتالوں کو محدود کرنے یا انہیں ممنوع قرار دینے، اور اجتماعی سودے بازی کے حقوق کو ختم کرنے کے لیئے استعمال کیا گیا تھا؛ مزدور گروپوں نے اطلاع دی کہ سال کے دوران ESMA کا اطلاق نہیں کیا گیا تھا۔

b۔ منظّم ہونے اور اجتماعی سودے بازی کرنے کا حق

2008 کے IRA کے تحت کارکنوں کے بعض شعبوں میں اجتماعی سودے بازی کو تحفظ دیا گیا ہے۔ جن شعبوں کو تحفظ حاصل نہیں ہے وہ وہی ہیں جنہیں Freedom of Association سے الگ کر دیا گیا ہے: فلاحی یا غیر تجارتی تنظیمیں، خود اپنا کاروبار کرنے والے کارکن، زرعی مزدور، دوسرے غیر رسمی شعبوں میں کام کرنے والے لوگ، اور طبّی عملے، آگ بجھانے والے، اور ٹیچرز سمیت سرکاری شعبوں میں کام کرنے والے بیشتر ملازمین۔ IRA کے تحت آجروں کو یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی ممانعت ہے، اور کسی بھی آجر کو جس نے اس قانون کی سنگین خلاف ورزیاں کی ہوں، جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے لیکن قید کی نہیں۔ عملی طور پر، IRA پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

ITUC نے اطلاع دی کہ آجروں نے کارکنوں کو یونین کی رکنیت کا نااہل قرار دینے کے لیئے انہیں برائے نام مینیجروں کے عہدوں پر ترقی دے دی۔ ITUC کے مطابق، پچھلے برسوں میں ایسے واقعات ہوئے ہیں جب انتظامیہ نے ادارے میں یونین کی تشکیل کو روکنے کے لیئے ڈرانے دھمکانے، برطرفی اور بلیک لسٹنگ کے اقدامات کیئے ہیں۔

ITUC نے مارچ 2008 میں اینٹوں کے بھٹوں پر غلاموں کی طرح کام کرنے والے مزدوروں نے پنجاب کے سات اضلاع میں خود کو منظّم کرنے کی کوشش کی۔ سب سے بڑا اجتماع لاہور میں ہوا، جس میں تقریباً پانچ ہزار افراد نے شرکت کی۔

c۔ جبری یا لازمی مشقت کی ممانعت

پاکستان

قانون کے تحت غلامی اور ہر قسم کی جبری محنت کی ممانعت ہے۔ عملی زندگی میں، حکومت نے ان پابندیوں پر موثر طریقے سے عمل درآمد نہیں کیا، اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں ایسے طریقے استعمال کیئے گئے۔

1992 کے The Bonded Labor System (Abolition) Act کے تحت قرض کے عوض جبری محنت غیر قانونی ہے۔ اس قانون کے تحت تمام موجودہ قرضے منسوخ کر دیے گئے ہیں، ان قرضوں کی واپسی کے لیئے مقدمے دائر کرنے کی ممانعت ہے، اور قانون پر عمل درآمد کے لیئے District Vigilance Committee کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ تاہم، ٹیکنکل نقائص، وفاقی اور مقامی حکومت کے ڈھانچے میں تبدیلیوں، اور عمل درآمد کے لیئے بجٹ نہ ہونے کی وجہ سے، اس قانون پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں، قانون نافذ کرنے والے اداروں نے جبری محنت کے تحت جرائم فوجداری قانون کی دوسری شقوں کے تحت درج کیئے۔ سال کے دوران، سندھ کے ان علاقوں میں جہاں قرضوں کی ادائیگی کے لیئے جبری طور پر کام کرنے والے مزدورں کی تعداد بہت زیادہ ہے، پولیس کی طرف سے ایسے مزدوروں کو رہائی دلانے کی شرح میں 140 سے 200 فیصد تک اضافہ ہوا۔ پنجاب میں جبری یا قرض کی ضمانت کے طور پر کام کرنے والے مزدوروں کے بارے میں درج شدہ جرائم کی تعداد میں 10 فیصد اضافہ ہوا۔

غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ بانڈڈ لیبر کی کسی نہ کسی شکل میں، دس لاکھ سے زیادہ افراد کام کر رہے تھے۔ ان کی بیشتر تعداد سندھ اور پنجاب میں تھی۔ قرض کی ادائیگی کے لیئے جبری طور پر کام کرنے والے بیشتر مزدور نچلی ذات کے ہندو، عیسائی، یا معاشرتی اور اقتصادی طور پر پسماندہ مسلمان تھے۔ جبری طور پر کام کرنے والے بیشتر مزدور، زراعت میں، اور اینٹوں، شیشے، قالین اور ماہی گیری کی صنعتوں میں کام کرتے تھے۔

قرضوں کی ادائیگی کے لیئے جبری طور پر کام کرنے والے مزدوروں کو اکثر یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کے قرضے پوری طرح ادا ہو گئے ہیں یا نہیں۔ جبری طور پر کام کرنے والے بعض مزدور، رہائی ملنے کے بعد، کوئی دوسرا روزگار نہ ملنے کی وجہ سے، پھر اپنی پرانی حیثیت پر واپس آ گئے۔ زمینداروں اور اینٹوں کے بھٹوں کے مالکان اور بااثر سیاست دانوں کے درمیان گٹھ جوڑ کی وجہ سے، اس مسئلے کو مکمل طور پر ختم کرنے میں رکاوٹ پڑی۔

فریڈم ہاؤس کی 2008 کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ قرضے کی ادائیگی کے لیئے جبری طور پر کام کرنے والے مزدورں نے بعض اوقات اپنے اعضاء، خاص طور سے گردے، فروخت کر دیے تاکہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیئے رقم حاصل کر سکیں۔ اقوامِ متحدہ کے Integrated Regional Information Networks کے مطابق، Sindh Institute of Urology and Transplantation نے پنجاب میں ایک سروے کیا جس کے نتائج 2007 میں جاری کیئے گئے۔ ان نتائج سے ظاہر ہوا کہ گردے بیچنے والے 93 فیصد لوگوں کو اپنے قرضے ادا کرنے کے لیئے پیسے کی ضرورت تھی، اور ان میں سے 69 فیصد وہ مزدور تھے جو قرضوں کی ادائیگی کے لیئے غلاموں کی طرح کام کر رہے تھے۔ 2007 کے Human Organs and Tissues Transplant Ordinance کے باوجود، جس کے تحت گردوں کی خرید و فروخت جرم قرار دی گئی ہے، میڈیا میں سال کے دوران اس قسم کی رپورٹیں آتی رہیں جن میں مزدوروں نے اپنے گردے 84,000 روپے ($1,000) کی حقیر رقم کے لیئے بیچ دیے تھے۔

27 اکتوبر کو، اخبار ٹائم نے اطلاع دی کہ صوبہ سندھ میں کم از کم تین زمینداروں نے 150 سے زیادہ مزدوروں کو جو قرض کی ادائیگی کے لیئے جبری محنت کر رہے تھے، تیس دن سے زیادہ عرصے سے ان کی مرضی کے خلاف روک رکھا ہے۔ مقامی غیر سرکاری تنظیموں نے وکیلوں کا بندوبست کیا جنھوں نے مقامی عدالتوں میں ان مزدوروں کی رہائی کے لیئے، جو سب قرض کی وجہ سے جبری مزدوری کر رہے تھے، درخواستیں پیش کیں۔ یہ

مزدور، جن میں سے ایک تہائی بچے تھے، بے زمین کسان تھے۔ سندھ کے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے تمام مزدوروں کو رہا کرایا، اور ایک زمیندار کے خلاف فوجداری الزامات عائد کر دیے گئے ہیں۔

سال کے دوران، محنت، افرادی قوت، اور سمند پار پاکستانیوں کی وزارت نے بارہ کروڑ تیس لاکھ روپے (14 لاکھ ڈالر) کی رقم سے اینٹوں کے بھٹوں میں کام کرنے والے قرضدار مزدوروں کو نجات دلانے کا پراجیکٹ شروع کیا۔ اس پراجیکٹ کے تحت وزارت نے اینٹوں کے بھٹوں میں کام کرنے والے 11,000 مزدورں کے لیئے قومی شناختی کارڈ حاصل کیئے، اور آجروں کے قرض کی ادائیگی میں مدد دینے یا ان کے کام کے لیئے پیسہ فراہم کرنے کے لیئے ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ روپے ($140,000) کی رقم سے مزدورں کو بلا سود چھوٹے چھوٹے قرض دیے۔ پنجاب کی وزارتِ محنت نے اینٹوں کے تقریباً 200 بھٹوں اور 6,000 کو رجسٹر کیا تاکہ اس صنعت کو ضابطوں کے تحت لانے کے اقدامات کیا جا سکیں۔ وزارت نے مزدوروں کو مفت قانونی مدد فراہم کی، اور 2009 میں 150 سے زیادہ کیس رجسٹر کیئے۔

d۔ بچوں سے مشقت لینے کی ممانعت اور روزگار کے لیئے کم سے کم عمر

قانون کام کی جگہ پر بچوں کو استحصال سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ تاہم، بچوں کی مشقت کے خلاف قوانین پر عمل درآمد کمزور تھا، اور بچوں سے مشقت لیا جانا سنگین مسئلہ رہا۔

قانون کے تحت قرض کی ادائیگی کے عوض بچوں سے مشقت لینے کی سزا پانچ سال تک کی قید اور 50,000 روپے ($635) جرمانہ ہے۔ قانون کے تحت 14 برس سے کم عمر بچوں سے فیکٹریوں، کانوں، ریلوے میں کام لینے، اور کچرے میں سے چیتھڑے جمع کرانے، بندرگاہ کے علاقوں میں، آتشبازی کے کارخانوں میں، اور دوسرے خطرناک پیشوں میں کام لینے کی ممانعت ہے اور ان کے کام کے حالات حکومت کے ضابطوں کے تحت ہیں۔ حکومت نے چار پیشوں، اور 34 قسم کے مختلف کاموں کی نشاندہی کی ہے جو بچوں کے لیئے غیر قانونی ہیں۔ ان میں سڑکوں پر سودا بیچنا، سرجری کے آلات کی تیاری، گہرے سمندر میں ماہی گیری، چمڑے کی تیاری، اینٹیں بنانا، فٹ بال کی گیندوں کی تیاری، اور قالین کی بنائی شامل ہیں۔

قانون کے تحت بچوں کے لیئے دن میں کام کرنے کی حد سات گھنٹے ہے۔ اس میں تین گھنٹے کی محنت کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ بھی شامل ہے۔ قانون میں وہ اوقات بھی بتائے گئے ہیں جن کے دوران بچوں کو کام کرنے کی اجازت ہے اور چھٹی کا وقت بھی بتایا گیا ہے۔ کسی بچے کو اوور ٹائم کرنے یا رات کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور ہر بچے کو ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ، قانون کے تحت آجروں پر لازم ہے کہ وہ لیبر انسپکٹر کے معائنے کے لیئے ان بچوں کا رجسٹر رکھیں جو ان کے لیئے کام کر رہے ہیں۔ ان پابندیوں کا اطلاق خاندانی کاروباروں یا سرکاری اسکولوں پر نہیں ہوتا۔ قانون 18 سال سے کم عمر کے تمام بچوں کو استحصال سے تحفظ فراہم کرتا ہے، اور استحصال پر مبنی تفریح کی تعریف میں ایسے تمام سرگرمیاں آتی ہیں جن کا تعلق انسانی کھیلوں یا جنسی افعال یا دوسری رکیک حرکتوں سے ہو۔ جو والدین اپنے بچوں کا استحصال کرتے ہیں، وہ بھی قانون کے تحت جوابدہ ہیں۔

قوانین پر عمل درآمد سنگین مسئلہ تھا۔ میڈیا کے مطابق، حکومت کے اس حکم کی وجہ سے جس کے تحت صنعتی یونٹوں کا معائنہ ممنوع ہے، بچوں سے مشقت لینے کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ HRCP اور SPARC کے مطابق، ایک کروڑ سے ڈیڑھ کروڑ تک بچے مزدوروں کی طرح کام کر رہے تھے۔ ان میں بیشتر زراعت میں یہ گھریلو کام کرتے تھے۔ میڈیا نے اطلاع دی کہ غیر زرعی شعبے میں کام کرنے والے تقریباً 70 فیصد بچوں سے مشقت

چھوٹی چھوٹی ورکشاپس میں لی جاتی تھی۔اس طرح بچوں کی مشقت کے بارے میں قوانین پر عمل درآمد بہت مشکل ہو جاتا تھا کیوں کہ قانون کے تحت انسپکٹرز ایسے اداروں کا معائنہ نہیں کر سکتے جن میں 10 سے کم لوگ کام کرتے ہوں۔ محنت، افرادی قوت، اور سمندر پار پاکستانیوں کی وزارت کے پاس مخصوص قسم کے لیبر انسپکٹرز ایک چھوٹا سا گروپ تھا جن کے پاس بچوں کی مشقت کے قانون کے تحت تمام اداروں کا معائنہ کرنے کا اختیار تھا۔ حکام نے بیان کیا کہ خلاف ورزیوں پر فوری کارروائی کی گئی اور مقدمہ چلایا گیا۔امر واقعہ یہ ہے کہ مسئلے کی وسعت کے لحاظ سے، عمل درآمد کی کوششیں بالکل ناکافی تھیں۔انسپکٹروں کو برائے نام تربیت دی جاتی ہے،اور ان کے پاس وسائل بہت کم ہیں اور ان میں بد عنوانی کا امکان بہت زیادہ ہے۔ حکام نے غیر سرکاری تنظیموں کو مداخلت کے بغیر معائنوں کی اجازت دے دی، اور SPARC نے یہ بات نوٹ کی سرکاری افسروں نے عام طور سے ان کے دوروں میں تعاون کیا۔

قانون کے تحت بچوں کی مشقت کے قوانین کی خلاف ورزیوں پر 20,200 روپے (256$) تک کے جرمانے کی اجازت ہے۔ سال کے دوران، حکام نے اکثر خلاف ورزیاں کرنے والوں پر جرمانے عائد نہیں کیئے اور جب انھوں نے کیئے بھی تو وہ اتنے کم تھے کہ ان کی وجہ سے لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی۔ اگرچہ قانون نافذ کرنے والے حکام نے بچوں کی مشقت کے قوانین کی خلاف ورزیوں کے سینکڑوں کیسوں میں سزا دلوائی، لیکن عدالتوں نے جو جرمانے عائد کیئے ان کے رقم صوبہ سرحد میں اوسطاً 364 روپے (5$) سے لے کر بلوچستان میں 7,344 روپے (93$) تک تھی۔

بچوں کو اینٹوں کے بھٹوں اور قالین بننے کی صنعتوں میں، نیز زراعت میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔انہیں یہ کام اپنے گھرانے کے قرض کی ذمہ داری کے عوض کرنا پڑا جو جاگیر داروں، زمینداروں یا اینٹوں کے بھٹوں کے مالکوں سے لیا گیا تھا۔ مارچ میں National Coalition Against Child Labor نے قرض کے عوض جبری طور پر کام کرنے والے مزدوروں (bonded labor) کے بارے میں رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا ہے کہ بچوں سمیت، زرعی شعبے میں بانڈڈ لیبر کے طور کام کرنے والے افراد کی تعداد 17 لاکھ تھی۔اس رپورٹ میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ Bonded Labour System (Abolition) Act 1992 میں ترامیم کی جائیں۔

e۔ کام کے قابلِ قبول حالات

کم از کم مقررہ ماہانہ اجرت 6,000 روپے (76$) تھی۔ یہ وہ اجرت تھی جو 4,000 روپے (51$) میں مارچ 2008 میں اضافے کی بعد مقرر ہوئی۔اس کا اطلاق صرف ان صنعتی اور تجارتی اداروں پر ہوتا تھا جن میں کام کرنے والوں کی تعداد 50 یا اس سے زیادہ تھی۔ کم سے کم قومی معاوضے سے کارکنوں اور ان کے اہلِ خانہ کو اچھا معیار زندگی میسر نہیں آتا تھا اور یہ پاکستان ورکرز فیڈریشن کے کم از کم 12,000 روپے (152$) ماہانہ کے مطالبے سے کہیں کم تھا۔ بہت سی اقسام کے کارکنوں پر، جیسے وہ لوگ جو ایسے اقتصادی شعبوں میں کام کرتے ہیں جن پر لگے بندھے ضابطوں کو اطلاق نہیں ہوتا، گھریلو ملازمین، اور کام کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والے مزدوروں پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

وفاقی قانون کے تحت ہفتے میں کام کے گھنٹوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد 48 ہے (جو فیکٹریاں مخصوص سیزنوں میں کام کرتی ہیں ان کے لیئے 54 گھنٹے)۔ کام کے دن کے دوران آرام کے وقفے ملتے ہیں اور تنخواہ کے ساتھ سالانہ چھٹیاں دی جاتی ہیں۔ان ضابطوں کا اطلاق زرعی شعبے کے کارکنوں پر، ایسی فیکٹریوں میں کام کرنے والوں پر جن میں کارکنوں کی تعداد 10 سے کم ہو، گھریلو ملازمین، اور کنٹریکٹرز پر نہیں ہوتا تھا۔ وفاقی لیبر کوڈ کے

پاکستان

تحت جو دوسرے اضافی فوائد دیے جانے ضروری تھے ان میں اوور ٹائم کی تنخواہ، سالانہ اور بیماری کی چھٹیاں، علاج معالجے کی سہولتیں، کارکنوں کے بچوں کے لیئے تعلیم، سوشل سیکورٹی، ضعیفی کی عمر کے فوائد، (old age benefits) اور ورکرز ویلفیئر فنڈ شامل ہیں۔

صحت اور سیفٹی کے معیار کمزور تھے۔ کانوں میں حفاظت اور صحت کے ضابطوں کی پابندی کا شدید فقدان تھا۔ مثال کے طور پر، کانوں میں داخل ہونے اور واپس جانے، اور ہوا کے آنے جانے کے لیئے ایک ہی راستہ تھا۔ کارکن اپنے روزگار کو خطرے میں ڈالے بغیر، خود کو کام کے خطرناک حالات سے الگ نہیں کر سکتے تھے۔

مزدوروں کے بارے میں ضابطوں پر عمل درآمد کی بنیادی ذمے داری صوبائی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ محدود وسائل، کرپشن، اور قواعد و ضوابط کے ناکافی انتظامات کی وجہ سے قوانین پر عمل درآمد غیر موثر تھا۔ ITUC کے مطابق، سندھ اور پنجاب میں لیبر انسپکٹرز نے بعض آجروں کو معائنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ بہت سے کارکن اپنے حقوق کے بارے میں بے خبر رہے، خاص طور سے محنت کے ایسے شعبوں میں جو لگے بندھے ضابطوں کے تحت کام نہیں کرتے۔